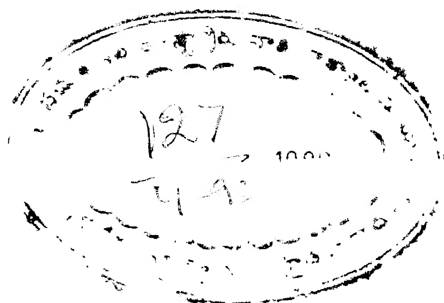
خیالاتِ حاویؔ

(شعری مجموعہ)





مُرتب :
محبوب علی خاں اخگرؔ قادری
تلمیذ
حضرت غلام علی حاویؔ



یہ دُنیا اور اِس دُنیا کی ہر اک چیز فانی ہے
مگر، تصویر کچھ دن یادگارِ زندگانی ہے } حاوی

الحاج مولوی غلام علی حاوی مرحوم جانشین حضرت صفی اورنگ آبادی

○ کتاب : خیالاتِ حاوی
○ صفحات : (۳۶۴) کے علاوہ خصوصی مضمون (۲۰) صفحات اور تصاویر (۲۰) صفحات ۔ کل صفحات [۴۰۴]
○ مرتب : محبوب علی خاں اخگر قادری
○ اشاعت : جون ۱۹۹۲ء
○ پہلی بار : پانچ سو [۵۰۰]

○ کتابت : محمد عبدالرؤف
○ سرورق : (تصویر) لعل محمد صدیقی [جمال مارکٹ چھتہ بازار]
○ خوشنویسی : سلام خوشنویس

○ طباعت لیتھو : دائرہ پریس، چھتہ بازار، حیدرآباد
○ طباعت سرورق : سرور آفسیٹ پریس ۔ لکڑی کا پل ۔ حیدرآباد
○ تصاویر : پاکیزہ فوٹو اسٹوڈیو ۔ یاقوت پورہ ۔ حیدرآباد
○ جلد سازی : حفیظیہ بک بائینڈنگ ورکس، چھتہ بازار ۔ حیدرآباد
○ قیمت : عام خریداروں کے لیے ساٹھ روپے (RS.60/=)
○ لائبریریز کے لیے : اسّی روپے (RS.80/=) مجلد
امریکہ کے لیے 20/ ڈالر
ملنے کے پتے :
○ اسٹوڈنٹس بک ہاؤس ۔ چار مینار ۔ حیدرآباد
○ حسامی بک ڈپو ۔ مچھلی کمان ۔ حیدرآباد
○ اخگر : نصیب منشن 2/17/262-3-19 جہاں نما ۔ حیدرآباد ۲۵۳-۵۰۰

حضرت حاوی — بیک نظر

- نام : الحاج غلام علی
- تخلص: (پہلے) صنیف (بعد) حاوی ؛ عطا کردہ حضرت کیفی حیدرآبادی مرحوم
- ولدیت: محمد عباس علی مرحوم
- تاریخ پیدائش: ۲۷ جمادی الآخر ۱۳۱۷ھ
- مقام پیدائش: حیدرآباد ؛ محلہ چھاؤنی غلام مرتضیٰ کمنداں
- علمی قابلیت: مولوی جامعہ نظامیہ ۱۳۴۰ھ ؛ منشی فاضل پنجاب ۱۹۳۰ء منشی فاضل مدراس ۱۹۳۱ء
- ملازمت: خزانہ عامرہ، سرکار عالی ۱۳۳۹ ف
- تاریخ وظیفہ: ۱۹۵۴ء
- تلمذ: تلمیذ و جانشین حضرت صفی اورنگ آبادی
- انتقال: ۵ مارچ ۱۹۶۹ء م ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ بعمر ۷۱ سال
- تدفین: احاطۂ قادری چمن ۔ جنگم میٹ

- نام فرزند: محمد یحییٰ خالد ۔ مقیم کینیڈا

تلامذہ صفی کے علاوہ

- عبدالحفیظ ہمسر
- محبوب علی خاں اخگر
- محمد عثمان ایمن
- سید اکبر علی رفیق القادری
- عبدالوہاب ضیا فاروقی پروپرائٹر ہلال پن اسٹور گلزار حوض

فہرست

فہرستِ مضامین

غزلیں ۷۳

حضرت الحاج مولانا غلام علی حاوی مغفور
جانشین حضرت صفی اورنگ آبادی





الحاج محمد یحییٰ ابن حضرت حاوی مغفور

فرزند
و
نبیرگان
حضرت حاوی مغفور



الحاج محمد یحییٰ ابن حضرت حاوی مغفور ○ محمد طارق یحییٰ ○ حافظ خالد ابراہیم یحییٰ

کے مایۂ ناز اہلِ زبان عظیم المرتبت استادِ سخن سے دُنیائے ادب و شاعری محروم ہوگئی۔ دوسرے دن منزلِ آخرت "قادری چمن" میں دفن کیا گیا۔

ان کے انتقال پر خواجہ عبدالعلی صدیقی نقشبندی القادری نے "تاریخِ ارتحال" کے عنوان سے گلہائے عقیدت پیش کئے تھے[1] جسے سید یوسف الدین یوسف (تلمیذ حضرت صفی و سب ایڈیٹر) نے اپنے مضمون کے ساتھ روزنامہ رہنمائے دکن میں ۲۵ مارچ ۱۹۷۰ء کو شائع کیا تھا۔ ان کے فرزند محمد یحییٰ خالد اونٹوریو، کینڈا میں اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ آسودہ حال زندگی گزار رہے ہیں جن کے تا حال دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ دونوں لڑکے الرشید اسلامک انسٹی ٹیوٹ میں زیرِ تعلیم ہیں۔ بڑا لڑکا خالد ابراہیم یحییٰ حافظِ قرآن ہے اور جماعت عالم کا طالبِ علم بھی۔ چھوٹا لڑکا طارق یحییٰ بھی پانچ پارے حفظ کر چکا ہے۔

حضرت حادی فربہ اندام متوسط قامت تھے۔ رنگ گندمی۔ آنکھیں نمایاں اور روشن، علم و دانائی کی غماز۔ کشادہ پیشانی۔ سر پر انگریزی تراش کے مطابق کٹے ہوئے بال۔ داڑھی منڈھاتے تھے۔ باریک مونچھیں۔ ہمیشہ صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ شیروانی زیبِ تن کئے سر پر اکثر ترکی ٹوپی پہنتے تو بہت سجیلے اور وجیہہ نظر آتے جن سے شخصیت پسندیدہ اور دل کش معلوم ہوتی۔ کلام تحت اللفظ سناتے تھے مگر استادانہ شان کے ساتھ نرم لہجے میں۔ رہن سہن اور آدابِ نشست و برخاست سے حیدرآبادی تہذیب کی نمائندگی ظاہر ہوتی تھی۔ کسی سے ملتے تو خوش اخلاقی سے پیش آتے۔ اپنے سے بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے۔ دکنی مٹی کے خمیر کی وجہ سے علم و فن میں کمال اور قابلیت تامہ رکھنے کے باوجود طبیعت

---

[1] دیکھئے متفرقات

میں غرور و نخوت یا خود پسندی کا دور دور گزر نہیں تھا۔ حال آں کہ شاعر کے ساتھ اس کی نرگسیت ضروری سمجھی جاتی ہے۔ مزاج میں سادگی اور انکسار تھا۔ وہ ہمیشہ شہرت سے بے نیاز رہے۔ اس دور کے ہم عصر شعراء اور اساتذہ میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اُنھوں نے بہت کم دوست بنائے لیکن جس سے بھی دوستی کی آخر تک خوبی کے ساتھ نبھائی۔ وہ صوم صلوٰۃ کے پابند اور دیندار بھی تھے۔ ۱۲ر جمادی الاول ۱۳۲۵ھ کو سید محمد عُمر حُسینی کے ہاتھ پر بیعت کی۔

ان کا مطالعہ گہرا اور محققانہ تھا۔ وہ بہت ذہین تھے۔ ان کی استعدادِ علمی وسعتِ معلومات، فنی قابلیت اور فکرِ رسا مسلمہ تھی۔ اردو زبان کے علاوہ عربی اور فارسی ادب و شاعری کے عمیق مطالعے سے انھیں نہ صرف تمام اصنافِ سخن پر کامل دستگاہ اور قدرت حاصل تھی بلکہ ان میں ایک صحت مند، روشن اور وسیع اور گہری فکری بصیرت بھی پائی جاتی تھی جس نے ان کی شاعری میں چار چاند لگا دیئے۔ ان کا کلام فکر و فن، مسائل اور علمی اعتبار سے منفرد خصوصیات کا حامل ہے جو اپنے لطفِ زبان اور حُسنِ بیان کے لحاظ سے علاحدہ شناخت رکھتا ہے۔ وہ ماہرِ علمِ عروض تھے۔ عروض دانی میں اُستادانہ ملکہ رکھنے کی وجہ سے ان کا قول مستند مانا جاتا تھا۔ وہ بہت زود فہم تھے۔ عربی اور فارسی کے استادانِ سُخن کا کلام پڑھنے سے فکر و تخیل میں مزید تیزی پیدا ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اِن باتوں سے شعر و سُخن کی فنی باریکیوں پر گہری نظر کا پایا جانا لازمی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی کسی شعری یا ادبی محفل میں عِلمی گفت و گو کرتے تو تحقیق کے ساتھ نپی تلی بات کہتے جسے قبول کرنے میں دوسروں کو تامل نہیں ہوتا تھا۔ ادب و شاعری کے رموز و نکات پر استادانہ تبحّر کے تمام ہم عصر اساتذہ اور اردو داں حضرات قائل تھے۔

جس طرح حضرت صفیؔ اورنگ آبادی نے مکتب داغؔ کے شاعرانہ اوصاف

ی موروثی و امتیازی خصوصیات کو اپنا کر فصاحتِ بیان، سلاستِ زبان، روانی، شوخی و رنگینی، محاورہ بندی، ضرب الامثال اور رندانہ سرمستی جیسی خوبیوں کو اپنے زوال کلام کے ذریعہ پُرکیف اور دل نشین انداز عطا کیا اسی طرح ان کے جانشین ستادِ سخن حضرت حادی نے مکتبِ صفی کی خصوصیات اور منفرد رنگ تغزل کو ہی دلبری بخشی اور دل ربا انداز عطا کیا ہے جس سے روایتِ سخن قائم اور باقی رہیگی۔

حضرت صفی کے زیر سرپرستی ۱۹۵۱ء میں "بزم تلامذہ صفی" کا قیام عمل میں آیا۔ س کے صدر میر بہادر علی جوہر اور سعید اختر معتمد تھے۔ ۱۹۵۳ء میں تنظیم جدید کے ساتھ باضابطہ دستور العمل مرتب کیا گیا اور ۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۳ء کو اس دستور ی باقاعدہ توثیق ہوئی۔ حالات بدلتے رہے۔ تیسرے اور آخری معتمد بزم جناب حبوب علیخان اخگر [تلمیذ حضرت حادی] ہیں جن کی فطرت کوہ کنی سے ایک بسوط تذکرہ "تلامذہ صفی" ۱۹۹۱ء میں منظرِ عام پر آنے کے بعد شعر و سخن کے پرانوں ر ادب کے دِل دادوں سے داد و تحسین حاصل کیا۔ اسی تذکرہ میں حضرت حادی سے متعلق مختصر معلومات بھی ہیں۔ جس کے مطالعہ سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ س تشنگی کو ان کے مجموعہ کلام "خیالاتِ حادی" میں شامل مضامین سے پورا کرنے ی کوشش کی جارہی ہے۔ ۱۹۵۴ء میں پیغمبرِ سخن حضرت صفی اورنگ آبادی راہی ملکِ قا ہوئے تو ان کی سرپرستی میں قائم شدہ "بزم تلامذہ صفی" کے ارکین اور دیگر کشادہ ذہن پُرخلوص شاگردوں نے متفقہ طور پر حضرت غلام علی حادی کو جانشین تخب کیا۔ بعضوں نے گمراہی کی وجہ سے اور جلبِ منفعت کی خاطر علاحدگی اختیار ی۔ متوازی انجمن "ادارۂ ادبستان صفی" کے نام سے بنائی اور جناب خیالی کو مزد کیا۔ سخنورانِ دکن اور ادبی دُنیا بخوبی جانتی ہے کہ کس نے زبان و ادب ی کتنی خدمت کی!

جیسا کہ اس سے قبل ذِکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت صفی نے اپنی زندگی ی میں بعض فنی متوسلین کو اپنے شاگرد رشید حضرت حادی سے وابستہ کردیا تھا

تو ان وابستگان کے علاوہ جانشینی کے بعد دیگر مخلص استاد بھائی بھی آپ سے رجوع ہونے لگے۔ ان کے علاوہ اور بھی صاحبِ ذوق شعراء نے آپ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ آپ نے اپنے شاگردوں کی باقاعدہ فہرست مرتب نہیں کی تھی جس سے متعین طور پر استفادہ کرنے والوں کی نشان دہی کی جا سکے زیادہ تر تو استاد برادری تھی اور بعض دوسرے مکتبِ سخن سے تعلق رکھنے والے تھے۔ محدود معلومات کے اعتبار سے نمایاں اور ممتاز نام الحاج محبوب علیخان اخگر کا نظر آتا ہے جنھیں ۱۹۵۵ء سے تلمذ کا اعزاز حاصل رہا۔ اس سے قبل وہ حضرت عاصم نلگنڈوی کے شاگرد مہر اور حضرت ضامن کنتوری کے شاگرد میر محمد علی فقیر سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ حضرت حاوی نے مادری زبان اُردو کے علاوہ فارسی اور عربی میں بھی اپنے افکار کو شعری سانچوں میں قلم بند کیا ہے۔ ان کے کلام میں تاریخ گوئی کے نمونے اور عربی قطعات بھی ملتے ہیں۔ اکثر غزلیں اور نظمیں مقامی جریدوں کے علاوہ دینی اور ادبی رسالوں جیسے "دین و دنیا" (دہلی) "ہمایوں" (دہلی) "ارشاد" اور "النور" (حیدرآباد) میں شائع ہو چکی ہیں۔ حیدرآباد کے ماہ نامہ "ارشاد" میں صنائع بدائع اور علم عروض کے دیگر عنوانات پر مستقل مضامین شائع ہوتے رہے ہیں لیکن اس کا سلسلہ زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ "غزل اور اس کا بانکپن" کے زیرِ عنوان ایک تحقیقی اور جامع مضمون بھی تحریر کیا تھا۔ حضرت شاہ قادری رح کے دیوان پر "سیح مج" کے عنوان سے ایک ایسا مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں ان کے قلم کا جادو نظر آتا ہے۔ اس تحریر کو ان کی نثر کا شاہکار کہا جا سکتا ہے ایک مرتبہ حضرت کیفی پر بھی بہ یک نشست مقالہ سپردِ قلم کیا تھا جس سے ان کی یادداشت حاضر دماغی اور طرزِ تحریر و اسلوب نگارش کا ثبوت ملتا ہے۔ حلقۂ احباب کی خواہش اور شاگردوں کے اصرار پر علم عروض سے متعلق عمدہ اور مکمل کتاب مرتب کرنے سے اتفاق کر لیا تھا۔ مسودہ کی شکل میں کام کا آغاز ہو چکا تھا لیکن افسوس کہ صحت کی خرابی اور عمر نے وفا نہ کی۔ نے اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی

ت ندی۔ کاش کوئی قدر داں "ارشاد" میں مطبوعہ مضامین اور دیگر تحریروں
یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کر سکے تو یہ ایک ادبی خدمت ہوگی۔

پیغمبرِ سخن، امامِ غزل اور ثانی داغ دہلوی حضرت صفی اورنگ آبادی کے
ان کی بابت ان کی سوانح عمری (مرتبہ جناب محمد نور الدین خان صاحب)
ذکر آ چکا ہے۔ دیوان سے کلام کے انتخاب کے سلسلہ میں اولیت تو اس کمیٹی
حاصل ہے جسے ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی نے تشکیل دی تھی جس میں جانشین صفی
رت حاوی کے علاوہ مولانا سید عبد الباقی شطاری، میر بہادر علی جوہر، ڈاکٹر
معین الدین یوسفی، میر [illegible] قریشی اور یہ خاکسار طالب علم شامل تھے۔ افسوس کہ یہ
ب کلام بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر منصۂ شہود پر آنے کی بجائے راقم الحروف
ذریعہ "ادارۂ ادبیاتِ اردو" میں محفوظ کروا دیا گیا تاکہ محققین استفادہ
سکیں۔ مزید تفصیلات کے لیے تذکرۂ "شمعِ فروزاں" مرتبہ عمر خالدی (ص ۱۶۲
[illegible]) ملاحظہ کیجئے۔ اس کے قطع نظر بعد میں مختلف ناموں سے شائع ہونے
لے چار مجموعہ کلام میں سب سے پہلے سید مبارز الدین رفعت نے "انتخاب کلام
اورنگ آبادی" ۱۹۶۱ء میں شائع کیا۔

حضرت حاوی نے اپنے دیوان سے متعلق اس شعر میں پیش قیاسی کے طور
ں اندیشے کا اظہار فرمایا تھا کہ ؎

مضامین غیب کے لکھتے ہو حاوی ÷ نہ ہو جائے کہیں دیوان غائب

ایک اعتبار سے پورا ہی ہوا۔ زمانے کی بوقلمونی اور حالات کے تغیرات پر
تھی۔ دوربین نگاہوں نے تاڑ لیا ہوگا۔ عاقبت اندیشی سے اپنے کلام کی دو
یں رکھیں جس کا علم صرف گوشہ نشین سعادت مند سپوت ہی کو تھا۔ کیوں کہ
الحروف نے تذکرۂ "تلامذہ صفی اورنگ آبادی" میں (تعارف نامہ) "تم ہی بتلاؤ
ہم بتلائیں کیا" کے زیر عنوان کتاب کے مرتب جناب محبوب علیخان صاحب اخگر
حوالے سے صفحہ ۳۵ و ۳۶ پر اس المیہ حادثہ کا [illegible] لکھا تھا کہ کس طرح

معلم عبیدی مرحوم اور ان کے لڑکوں کی تحویل سے دیوان حادی غائب ہو گیا لیکن الحمد للہ کہ جب اس افسوس ناک اور دل گداز واقعہ کی اطلاع ان کے صاحبزادے کو کینیڈا پہنچی تو انھوں نے جواباً اخگر صاحب کو خوشخبری دی کہ اس کی دوسری نقل ان کے چچا صابر علی شاکر مرحوم کے گھر میں محفوظ ہے اور خواہش کے ساتھ ساتھ ان سے درخواست کی کہ وہ مجموعہ کلام وہاں سے حاصل کر کے ترتیب و اشاعت کی ذمہ داری قبول کریں۔ یہ اہم ترین فریضہ ان جیسے مستعد فعال، حرکیاتی اور دُھنی شخصیت کے علاوہ کسی اور کے بس کا نہیں تھا۔ ایسے موقعوں پر جب اللہ کسی کے نام اور کام کو زندہ و باقی رکھنا چاہتا ہے تو کسی اہلِ خرد کو جنوں آشنا کر دیتا ہے اور وہ کام کی تکمیل کا بیڑہ اپنے سر لے کر علمی اور ادبی یادگار چھوڑ جاتے ہیں۔ حضرت حادی کے شاگردِ رشید اخگر صاحب اور حادی صاحب کے فرزندِ ارجمند محمد یحییٰ خالد نے یہی تو کیا! ایک نے اپنے والد کے علمی ورثہ کی اشاعت و حفاظت کے لیے مالی ذمہ داری کا حق ادا کیا تو دوسرے نے اپنے شفیق استاد کے شعری سرمایہ کی ترتیب و تدوین کے علمی کام اور کتابت و طباعت کے سارے عملی مراحل طے کر کے ایک سچے ادب شناس اور مخلص شاگرد ہونے کا بیّن ثبوت دیا۔ ہر دو کی یہ مخلصانہ اور فرزندانہ خدمات ہر اعتبار سے لائق ستائش اور قابلِ مبارک باد ہے کہ انھوں نے ان قیمتی اوراق کو برگِ خزاں رسیدہ بن جانے سے محفوظ کر لیا۔ دیوان کے ایک نسخہ کی گم شدگی اور دوسرے کی بازیافت سخنوروں اور سخن شناسوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ورنہ اردو زبان کی شعر و سخن کی دنیا ان زریں "خیالاتِ حادی" کی دولتِ نایاب سے محروم رہتی!

مجھے کم عمری سے شعر و ادب میں دلچسپی تھی۔ اسی ذوقِ ادب اور علم کی طلب نے اس دور کے علماء ادباء اور شعراء کی محفلوں میں بار حاصل کرنے کے موقعے عطا کیے۔ ڈاکٹر یوسفی مرحوم کا میرے والد سے صاحب سلامت تھی۔ والد کی

رحلت کے بعد انہوں نے مجھے عربی سیکھنے کے لیے اپنے استاد مولوی سید عبدالباقی شطاریؒ کے ہاں پیش کیا تھا۔ ان سے شرف نیاز میرے لیے باعث برکت ہوا۔ ان کی معرفت حضرت صفی اورنگ آبادی سے تجدید نیاز اور حضرت حادی سے مکرر تعارف کی عزت حاصل ہوئی۔ اس سے قبل ڈاکٹر یوسفی کی بدولت بیشتر "تلانذہ صفی" جیسے میر بہادر علی جوہر، سید غوث یقین، حامی مصلی، میر سرفراز علی ناوک، عبدالوحید یکتا، خواجہ شوق، عبدالوہاب غنی وغیرہ سے ع "گرچہ خردیم نسبت است بزرگ" کے مصداق کرم گسترانہ روابط تھے۔ خیالی مرحوم تو ہم محلہ تھے۔ خاص طور پر حضرت حادی، جوہر، اور یقین کی مجھ طالب علم پر مشفقانہ نظرِ عنایت رہی۔ میرے اور جناب ناوک کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑے تھے مگر ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ جب کہ حالات کی ستم ظریفی "کج کلاہی" کو سپر انداز نہ کرسکی۔ بڑا عجیب سینمری دور تھا! ان چند برسوں کی یادیں نیم بسمل بنانے کے لیئے کافی ہیں۔

کسی بھی شخصیت سے ملاقات کی مدت جتنی طویل ہوگی اتنی ہی یا دول کی عمر دراز ہوگی۔ اس مختصر سے مضمون میں تقریباً پندرہ سالہ رفاقت و معیت کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ یادگار مشاعروں اور ادبی نشستوں کی تفصیلات بیان کرنے کے لیئے دفتر چاہیئے۔ الفاظ کے ان ننھے دائروں میں ان سب بیتے لمحات کا کم وقت میں سمونا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

شاعری نہ صرف افکار و خیالات کے اظہار کا ایک موثر وسیلہ ہے بلکہ اس کے ذریعہ شخصیت کی بھی آئینہ داری ہوتی ہے۔ جب ہم کسی شاعر کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اس کے اشعار میں جو بے ساختگی، آمد اور جوش ہے وہ برائے شعر گفتن نہیں ہے بلکہ حساس فطرت اور دانائے راز شخصیت کی ترجمان ہے جس نے شعر کا لباس پہن لیا ہے

کسی شعر کی خوبی اور اثر اندازی کا انحصار ندرتِ خیال اور اسلوب بیان پر ہوتا ہے جس میں موزوں اور برجستہ الفاظ کا استعمال ساحرانہ کیفیت پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تب ہی شاعری فردوسِ گوش ہونے کے باوصف ساحری بن جاتی ہے۔ حضرت حادی کے کلام میں بھی ہمیں بعض ایسے مقامات ملتے ہیں۔ ان کا کلام نہ صرف اپنے عہد کا مرقع ہے بلکہ بعض شعروں میں روایتی انداز کی بجائے جدید فکر بھی نمایاں معلوم ہوتی ہے۔ نمونۂ کلام میں اس کی مثالیں مل جائیں گی۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ انھوں نے تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کے ساتھ اردو شاعری کی مقبول ترین صنف غزل کو اپنایا اور مکتبِ صفی کی کامیاب اور قابل قدر علمبرداری کی ہے ؎

وہ ہے صنفِ غزل کی حُسن کاری ؛ نکھارا جس نے حادی شاعری کو

جہاں تک محاورہ بندی کا تعلق ہے اکثر شعراء کے کلام میں تکلف اور آورد معلوم ہوتا ہے۔ محاوروں کے استعمال کی خوبی یہ ہے کہ اس سے شعر میں حُسن پیدا ہو نہ کہ سقم! یہی برجستگی اور آمد کی دلیل ہوتی ہے۔ ان کے یہاں روز مرہ اور محاوروں کے استعمال میں روانی اور بے ساختگی ملتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

ایسی اثر نواز ہوئی داستانِ غم ؛ آئی زبان پر تو بنی میری جان پر
نانِ شبینہ اپنی کہاں؟ قرصِ مہ کہاں؟ ؛ پکوان پھیکا ہوتا ہے اونچی دکان پر
حضرت شیخ کے ارشاد یہ کیا حرف رکھوں ؛ بات چلے نہ پڑی ہیں کا تقاضہ سمجھا
نعمت میں شکرِ حق جو ادا ہو نہیں سکا ؛ قائل ہوں "قدرِ نعمت بعدِ زوال" کا
پالا اگر پڑے گا برہمن کو شیخ سے ؛ معلوم ہوگا بھاؤ اُسے آٹے دال کا
ہو نہ پُر لطف کیوں اس کی ملاقات ؛ مزہ باتوں میں صورت پر نمک ہے
نہیں انکار حادی مجھ کو اپنی وسعتِ دل کا ؛ مگر یہ دیکھتا ہوں اس میں دنیا کا پسارا ہے

حضرت حادی کا اور ان کی کائناتِ شعر کا تعارف انہی کی زبانی کچھ

اس طرح ہے ؎

میں بھی حادی خوشہ چینِ داغ ہوں ؛ کون کہہ سکتا ہے "دلّی دُور ہے"
تو مکتبِ صفی کی نمائندگی نہ چھوڑ ؛ حادی رہے غزل کے لیے کوئی سی طرح
حادی سے ابھی آپ کے واقف نہیں اکثر ؛ مشہور وہ کم اور ہے گم نام زیادہ

اس کے باوجود پھر ارشاد ہوتا ہے ؎

اردو کی پرورش میں ہمارا بھی خون ہے ؛ رنگین و شوخ کیوں نہ دکن کی زباں رہے
مزہ پھر کیوں نہ دے ہر شعر حادی ؛ غزل میں ہو جو چٹخارہ زباں کا
نہ پوچھو کائناتِ شعر حادی ؛ یہ اپنا اپنا اندازِ بیاں ہے
پیرِ مغاں نے رنگِ تخیل بدل دیا ؛ حادی مرے کلام میں کیفِ شراب ہے

"بابائے اردو" مولوی عبدالحقؒ کی (۹۰) ویں بہارِ عمر کے موقع پر ان کی خدمت میں منظوم تہنیت و تبریک کے بھی شعر قابل نقل ہیں جو پہلے اردو کے بارے میں ہیں پھر "بابائے اردو" کے۔

اسی طرح "شہنشاہِ رباعیات" سعدیٔ دکن "خیامِ ہند" "سرمدِ ثانی" حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی[1] سے متعلق انہی کی تقلید میں اپنے جذباتِ ستائش اسی صنفِ رباعی میں قلمبند کئے تھے جو ماہ نامہ "سب رس" حیدرآباد کے امجد نمبر بابتہ مئی، جون ۱۹۶۲ء میں "پیمبرِ رباعی" کے زیرِ عنوان صفحہ ۱۰۸ پر شائع ہوئے۔ ان آٹھ رباعیوں میں تاثرات کی گہر افشانی اپنی مثال آپ ہے۔

حضرت حادی دریائے سخن کے شناور تو تھے ہی۔ انھوں نے حمد، نعت، منقبت اور قصیدہ بھی لکھا۔ علّامہ حکیم سیّد عبدالباقی شطاریؒ کے فیضانِ علم سے مستفید ہوئے تھے۔ ان کی شادی [منعقدہ مورخہ ۲۵ ربیع الآخر ۱۳۵۲ھ[2] م ۱۲ مہر ۱۳۴۲ف] کے موقع پر بہ یک نشست چونسٹھ شعروں پر مشتمل طویل قصیدہ[3]

---

[1] ملاحظہ کیجئے متفرقات صفحہ ( ) [2] دیکھئے صفحہ ( ) [3] دیکھئے صفحہ ( )

لکھا تھا۔ پورے قصیدہ کا مطالعہ ہی سلاستِ زبان اور روانیٔ بیان کا لطف تازہ کرسکتا ہے۔

میں ادب کا ایک ادنیٰ طالبِ علم ہوں۔ نظر بظاہر جو غور کرسکا قرطاس و قلم کے سہارے پیش کرنے کی جسارت کررہا ہوں۔ شاعر کی فکرِ کلام میں کس طرح عکس ریز ہے ملاحظہ فرمائیے۔ یہاں لفظ آنسو یا اشک کے استعمال کی چند مثالیں دی جاتی ہیں۔

دکھاؤں کس کو آب و تاب میں اشکِ ندامت ÷ فرشتے لیں گے ہاتوں ہاتھ یہ ایسا گہر ہوگا
میرا ہر اشکِ ندامت ہے اساسِ مغفرت ÷ دھوپ سے یہ اڑنے والا قطرۂ شبنم نہیں
آنسو کا قطرہ آنکھ میں دُرِ یتیم تھا ÷ دیکھا نہیں کسی نے مگر چشمِ نم کے ساتھ
نہ جانے کتنے آنسو پی چکا ہوں ÷ جو ہم چشموں میں اتنی آبرو ہے
دھلا دیتے ہیں منہ اشکِ ندامت ÷ مری توبہ بہ عنوانِ وضو ہے

افسوس کہ پورا مجموعہ کلام میرے سامنے نہیں۔ ہمدست غزلوں کی روشنی میں ان شعروں میں معرفت و حقیقت کے مضامین کی طرف اشارہ ملتا ہے ویسے تو کلام میں بہ ہر عنوان طبع رواں اور طرزِ ادا کے جلوے نظر آئیں گے۔

رنگِ دنیا نہ دیکھ اس کو دیکھ! ÷ تیری دُنیا کو جو بدلتا ہے
ہے جو انفس میں وہی آفاق میں ÷ سعیٔ لاحاصل ہے حاصل کی تلاش
سلیقہ دیکھنے کا ہو تو پھر جس رنگ میں دیکھو ÷ یہی عالم سراپا عالمِ انوار ہو جائے
یہ تو کہئے کہ پتہ کون اٹھائے ان کا ÷ خود کو کھو بیٹھے ہیں جو آپ کو پانے والے
جس نے تجھ کو جان دی ہے تو بھی اس پہ جان دے ÷ ورنہ یہ جینا عبث یہ زندگی بے سود ہے
بندگی کر پھر دکھا اس کی خداوندی کی شان ÷ بن ایاز ایسا کہ دنیا چیخ اُٹھے محمود ہے
ذاتِ باری کا ہے عرفاں میسّر کس کو ÷ جتنے پہنچے ہیں وہ اپنے ہی گماں تک پہنچے
سجدے کا ذوق پائے گا کیا بے خودی کے ساتھ ÷ خود آگہی اگر نہ رہے بندگی کے ساتھ
بساطِ دل ہے شایانِ تجلّی ÷ مکاں کہتے ہیں جس کو لامکاں ہے
عظمتِ نقشِ پا خدا جانے ÷ ہم تو سجدے سے سر اٹھا نہ سکے

اشہبِ فکر جولانیاں دکھاتا ہے تو انفرادیت اُبھرنے سے باز نہیں رہ سکتی۔ اگر آپ مجموعۂ سخن "خیالاتِ حاویؔ" کے گلستاں کی گل چینی کریں گے تو ہر بار قندِ مکرر کا مزہ آئے گا۔ اس میں خندۂ گل بھی ہے تو اسی کے ساتھ گریۂ شبنم بھی ملے گا۔ یہ بات میرے بیان کی محتاج نہیں کہ تشبیہوں اور استعاروں کے بغیر شاعری ادھوری معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے بھی اسے برتا ہے۔ اس کے علاوہ اِن کے کلام میں رمزیت اور اشاریت بھی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

نِکھرتا ہے غزل کا رنگ حاویؔ ؛ اگر ہوں استعارے یا کِنائے

مہذب انداز میں شوخی کا انداز بھی غور کیجیے۔ کہیں کہیں تیور بھی خوب ہے۔

صید نکلا چاہتا ہے زد سے اے ناوک فگن ؛ شوق میں اک تیر کیا دو تیر کیا، سو تیر کیا

مجھ کو دیکھا تو شوخیاں سوجھیں ؛ پڑگئی گدگدی سی اعضاء میں

اے مرے چاند! اُٹھ نہ پہلو سے ؛ پھر کوئی ایسی رات ہو کہ نہ ہو

تم عیادت کے لیے کیا آ گئے ؛ خود بخود بیمار اچھا ہو گیا

شانہ اُلجھا ہے کسی کی زلف سے ؛ باہمی یہ کش مکش پیہم رہے

کلام کے مطالعہ کے بعد اربابِ سخن اور ماہرانِ فن اس بات سے ضرور اتفاق کریں گے کہ ادب کے آئینہ خانہ میں "خیالاتِ حاویؔ" ہمیشہ عزّت و قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا جو اُردو شاعری کے سرمایہ میں ایک اہم اور بیش بہا اضافہ ہے۔ حضرت غلام علی حاویؔ نے اپنے کم و بیش پچاس سالہ شعری سفر میں زبان و ادب کو خونِ جگر سے سینچا اور افکارِ عالیہ سے سیراب کیا۔ اس وقیع، فکر انگیز اور دل آویز شیریں زبان مجموعہ میں اہلِ ذوق کی ضیافتِ طبع کے لیے سب کچھ ملے گا۔ جس طرح آفتابِ غزل حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے میخانۂ سخن کی سیر کریں تو بے ساختہ یہ شعر زبان پر آجاتا ہے کہ ؎

ساقی تیرا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا ؛ جب تجھ نے یہ مے ظالم شیشے میں بھری ہوگی (علویؔ)

اِسی طرح ان کے ذی علم شاگردِ رشید اور جانشین کے خیال آفرین گلشنِ شاعری میں

قدم رنجہ ہوں تو بلا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ ع

بیں چمن میں کیا گیا گویا دبستان کھل گیا

متنوع خیالات، پُرکیف جذبات اور لطیف احساسات کی شگفتگی اور شادابی جب شعر کا پیکر اختیار کرتی ہے تو ان میں سے بعض قاری کے دل کی دھڑکنوں کا حصّہ بن جاتے ہیں مثلاً:

مرنے کے بعد اُن کا رہتا ہے نام زندہ ؛ لیتے ہیں زندگی سے جو کام زندگی کا

بڑھتے ہیں حوصلے جو نشیب و فراز ہو ؛ کتراتا ہوں راہ کو ہموار دیکھ کر

توبہ شکن بہار ہے تقویٰ شکن ہے یار ؛ پرہیزگار بھی نہیں پرہیزگار آج

نہ بُرے تم نہ ٹھہرے ہم نہ ملاقات بُری ؛ کیوں خفا ہوتے ہو؟ ہوتی ہے بُری بات بُری

آرزو قلبِ شکستہ میں کہاں ؛ ایک شیشہ وہ بھی چکنا چور ہے

ہجوم یاس و حسرت سے ہے دل کی خانہ ویرانی ؛ ہمارا کیا اسے جیسا بھی رکھیئے آپ کا گھر ہے

صدائیں درد میں ڈوبی ہوئی ہیں !! ؛ نہ جانے تم نے کتنے دِل دُکھائے

پکارو اُس کو دل ہی دل میں حاوی ؛ وہ سُنتا ہے صدا جائے نہ جائے

نہ سر محتاجِ بالیں ہے نہ تن مرہونِ بستر ہے ؛ تکلف برطرف فرشِ زمیں آغوشِ مادر ہے

دل ہے معمارِ آرزو حاوی ؛ وہ عمارت بنی کہ ڈھا نہ سکے

اُثاثہ اور پھر دل کا اُثاثہ ؛ اُمید۔ ارمان۔ حسرت۔ آرزو ہے

کبھی تھی دل میں ارمانوں کی ہلچل ؛ اب اس بستی میں سناٹا ہے ہُو ہے

کس کو اس کی دید کا مقدور ہے ؛ خود ہی ناظر وہی منظور ہے

تو مکرر نام سے مجھ کو پکار ؛ منتظر ہیں کان اس تکرار کے

اب اس شعر کی معنی آفرینی پر غور فرمائیے۔ فکر کی گہرائی بھی ہے اور وقت کی نبض شناسی بھی!

اور کیا تکلیف پہنچی گردشِ ایام سے ؛ ہم ذرا کروٹ بدل کر سو گئے آرام سے

ہاں اے غمِ حیات تماشا نہ بن کہیں ؛ دُنیا تو کھیلتی ہے ہر اک زندگی کے ساتھ

موت اور شئے ہے حُسن پہ مرنا کچھ اور ہے ÷ وہ زندگی کے بعد ہے یہ زندگی کے ساتھ
دن عمر کے تھوڑے ہیں ترے کام زیادہ ÷ آرام نہ لے طالبِ آرام، زیادہ
کس طرح نکالوں ترے ارمان کو دل سے ÷ مہمان کو محفل سے اُٹھایا نہیں جاتا
ننگِ نام و نشاں سراپا ہوں ÷ چشمِ عبرت ترا تماشا ہوں
پسِ پردہ ہے کیا خُدا جانے ÷ مجھ سے پردا ہے میں ہی پردا ہوں
تعجب ہے کہ جس کی یاد نے تڑپا دیا دل کو ÷ اسی کی یاد پھر وجہِ سکونِ قلبِ مضطر ہے
آسائشوں کو ڈھونڈنے والو حیات میں ÷ ملتے ہیں زندگی کے مزے حادثات میں
سیہ بختی اُجالا زندگی میں لا نہیں سکتی ÷ تو کیا اے روشنیٔ طبع تو کام آ نہیں سکتی
منصور کو ملی تھی سزا اس قصور کی ÷ کھو کر شعور بات نہ کھوئی شعور کی
متاعِ کون و مکاں لے کے کیا کرے حادی ÷ اسے عزیز فقط تیری ذات ہے ساقی
کہتے ہیں جس کو موت وہ نقلِ مقام ہے ÷ اکتا کے جب یہاں سے چلے تو وہاں رہے

اُوپر کی چند مثالوں سے واضح ہو گیا ہو گا کہ شاعری محض قلبی واردات کا بیان نہیں ہے بلکہ دوسری حیثیت سے حقیقت اور ماورائے حقیقت کے امتزاج کا نام بھی ہے۔ شاعر جب ذات سے بلند ہو کر اپنی آواز کو کائنات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو شاعری میں آفاقیت آجاتی ہے، اس کے داخلی اور خارجی وجدان کے ردِ عمل سے تخلیقی قوت فروغ پاتی ہے اور یہ تخلیقی قوت عرفان و آگہی کے اُفق سے شعر کے سانچے میں ڈھل کر صفحۂ قرطاس پر جلوہ افروز ہوتی ہے تو اب یہ شاعر کی ملک نہیں رہتی بلکہ سب کی میراث بن جاتی ہے۔

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ عظیم تر شاعر کے دیوان میں بھی طرح کے شعر ہوتے ہیں بہترین بھی اور کم اچھے بھی۔ اس میں پائی جانے والی خوبیوں کی نوعیت اپنے شعور و اِدراک اور مذاقِ سخن کے اعتبار سے جُداگانہ ہوتی ہے۔ تلاش و جستجو سے دُرِ نایاب بھی

یل جاتے ہیں جس سے بساطِ سخن جگمگا اٹھتی ہے۔

دکن کی خاک سے اُبھر کر یہیں کی خاک میں پنہاں ہونے والے عہد ساز شاعر بے بدل کی یہ شعری کائنات "خیالاتِ حادی" کا انمول تحفہ اہلِ ذوق کی نذر ہے جو غزل کے کاکلوں کو اس انداز سے سنوارنے والے کی ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا۔ ع

حقا بیانِ شوق بپایاں نمی رسد

[کنساس اسٹیٹ۔ ممالک متحدہ امریکہ] خواجہ معین الدین عزمی



سید عبد الحفیظ محفوظ

"خیالاتِ حادیؔ" کے سعادتمند مرتب!

علم ادب، شعر و فنِ عروض کا معدن علّامہ غلام علی حادیؔ اپنے وقت
کے خاموش و گمنام علماء میں سے تھے موصوف ہمیشہ نام و شہرت سے
گریزاں، علم و ادب کی خدمت میں کوشاں رہے۔ بہت کم لوگ
ہوں گے جنھوں نے آپ سے کما حقہ استفادہ کیا۔

علّامہ اگرچہ ایک پختہ و قادر الکلام شاعر تھے پھر بھی حضرت صفیؔ اورنگ آبادی
کو اپنا کلام دکھلاتے تھے۔ تاہم خود بھی استادِ سخن تھے ان کے چند
چنندہ شاگردوں میں سے جناب محبوب علی خان اخگرؔ بھی ہیں۔
ایک عرصہ تک موصوف شاعری میں علّامہ حادیؔ سے استفادہ کرتے
رہے۔ اب جبکہ علّامہ کے فرزند ارجمند اپنے مرحوم والد کے کلام کو
اہلِ علم کے استفادہ کے لیے شائع فرما رہے ہیں قابلِ مبارکباد
ہیں کہ انہوں نے اپنے والد بزرگوار کے علمی اثاثے کی حفاظت
کے ساتھ ساتھ ادب کی خدمت بھی انجام دی ہے۔

طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں جناب اخگرؔ کا انتخاب نہایت موزوں
ثابت ہوا اخگرؔ شاعری کے سوا اردو ادب کے خدمت گزاروں میں
ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں موصوف کی مرتبہ کتابیں تلامذہ صفیؔ اورنگ آبادی
و شمع فروزاں اور تاریخ و ادب، مصنفہ عمر خالدی) و محمد نورالدین خانصاحب
کی طباعت آپکی انتظامی صلاحیتوں کا بیّن ثبوت ہے۔ بہرحال علّامہ حادیؔ
کے فرزندِ حقیقی اور فرزندِ معنوی دونوں نے اپنا اپنا حق ادا کیا چنانچہ ان دونوں
کی کوششوں کا مظہر "خیالاتِ حادیؔ" کی صورت میں موجود ہے

بشیر باغ

سید عبدالحفیظ محفوظ

عرضِ مُرتّب

راقم الحروف کی مُرتبہ کتاب تذکرۂ "تلامذۂ حضرت صفیؔ اورنگ آبادی" (مطبوعہ ۱۹۹۱ء) میں ممتاز اہلِ قلم حضرات اس امر کا تفصیل سے ذکر فرما چکے ہیں کہ خاکسار نے مکتبِ داغؔ دہلوی کی آخری شمع حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے جانشین حضرت غلام علی حادیؔ سے ۱۹۵۵ء میں شرفِ تلمذ حاصل کیا تھا اور اس وابستگی کے بعد ۱۹۵۸ء میں "بزمِ تلامذۂ صفیؔ" کی معتمدی کے فرائض بھی اتفاقِ آرا سے احقر کے سپرد ہوئے تھے۔ خاکسار ہی اس بزم کا تیسرا اور آخری معتمد رہا۔ حالات کے انتشار اور پراگندگی کی وجہ سے پھر کسی نے اس بزم میں رُوح نہیں پھونکی۔

زیرِ نظر مجموعہ کلام کو ایک غیبی عطیہ اور قدرت کی اعجاز نمائی خیال کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ میں اپنی ہی دریافت کردہ معلومات کی وجہ سے دیوان کے تلف ہوجانے پر بہت ہی دل گرفتہ، افسردہ، ملول اور مایوس ہو چکا تھا جس کا ذکر میری مذکورہ کتاب میں جناب خواجہ معین الدین عزمی صاحب نے میرے حوالے سے اپنے گراں قدر مضمون "تم ہی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا" کے زیرِ عنوان صفحے ۳۵ و ۳۶ میں فرمایا ہے۔ لیکن جب اس کتاب کا ایک نسخہ عزیزی محمد یحییٰ خالد صاحب، فرزند حضرت غلام علی حادیؔ کو چچازاد بھائی کی طرف سے کینیڈا پہنچا تو انھوں نے اس تذکرہ کے مطالعہ کے بعد چونک کر فوراً مجھے اطلاع دی کہ کلام کی ایک اور نقل ان کے چچا صابر علی شاکرؔ مرحوم کے گھر میں محفوظ ہے اور میں اُسے وہاں سے حاصل کرلوں۔ اسی کے ساتھ مجھ سے خواہش کی کہ اسی کلام کی مدد سے دیوان کی ترتیب اور اشاعت کا کام بھی انجام دوں۔



مرتب: محبوب علی خاں اخگر قادری

کتابت اور طباعت کے جملہ مصارف ان کے ذمے رہیں گے۔

اواخر جولائی ۱۹۹۱ء میں دیوان کے دوسرے نسخے کے محفوظ ہونے کی خوش خبری نے گویا ایک طرح سے میرے رگ و پے میں مسرت کی لہر دوڑادی اور استاد محترم کے سالہا سال کی فکرِ سخن، رنگِ تغزل، عالمانہ افکار اور زریں خیالات کے شعری سرمایہ کی موجودگی سے دل مطمئن ہوگیا، لیکن بہ ایں ہمہ کلام کے انتخاب وترتیب واشاعت کی اہم ذمہ داری نے غور و فکر میں ڈبو دیا۔ یہ بات کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ اپنے استادِ سخن جانشین حضرت صفی کے کلام کی ترتیب و تدوین کا اہم ترین کام اور ادبی فریضہ مجھ جیسے کم سواد اور بے بضاعت کے ذمہ ہوگا۔ اگر میرے رفیق اور کرم فرما جناب خواجہ معین الدین عزمی صاحب کا بھرپور تعاون اور ان کی حوصلہ افزائی حاصل نہ ہوتی تو اس کام کو تنہا سرانجام دینے اور ذمہ داری قبول کرنے کی ہمت ہی نہ کرسکتا تھا۔ چناں چہ میں نے عزیزی محمد یحییٰ خالد صاحب کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس فرض کو پورا کرنے اور اہم ذمہ داری کو بحسن و خوبی نبھانے کی جسارت کی۔ استاذی حضرت ہادی کے حقیقی برادر زادوں مولوی حافظ عباس علی، محمد عبدالشکور، محمد عبدالقادر، محمد عبدالحیٔ و محمد عبدالرزاق صاحبان سے ربط قائم کرکے یہ مجموعہ کلام حاصل کرلیا اور شب و روز اس کام میں جٹ گیا۔ یہ مجموعہ کلام کیا ہے؟ الگ الگ اوراق پر چیدہ چیدہ غزلیں، نظمیں، قطعات وغیرہ حضرت ہی کے خوش خط میں لکھے موجود ہیں۔ بہت سی پرانی غزلوں کے اوراق بوسیدہ اور کرم خوردہ بھی ہیں۔ کسی ایک غزل کی پانچ تا سات نقلیں بھی ملیں جن میں اشعار کی تعداد کے اختلاف کے علاوہ بعض مصرعوں میں بھی لفظی اختلاف پایا گیا لیکن اس انتخابی کام میں میرے شریک و سہیم جناب عزمی صاحب اور جناب نظیر علی عدیل صاحب کی اعانت نے میری مشکل کو آسان کردیا۔ میں ان کے اس ادبی تعاون کا مشکور ہوں۔

حضرت ہادی کے سرسری حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام کو اپنی کتاب تذکرہ

"تلامذۂ حضرت صفیؔ" کے صفحے ۹۶ سے صفحے ۱۰۱ تک سپردِ قلم کیا ہوں۔ یہاں ان کا اعادہ نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس مجموعۂ کلام میں شعراء کرام اور ادیبوں کے مضامین سے ان کی مختصر سوانح اور شاعری پر روشنی پڑتی ہے اس لیئے میں نے مزید خامہ فرسائی سے احتراز کیا ہے۔

حضرت حادی نے نہ صرف اردو زبان میں شاعری کی تھی بلکہ انھوں نے فارسی اور عربی میں بھی شعر کہے۔ اُردو غزل تو ان کی محبوب صنف تھی لیکن اس کے علاوہ انھوں نے قصیدے، رُباعی، قطعات، نظمیں، مسدس اور مادّہ تاریخ سبھی پر بے تکلف طبع آزمائی کی ہے۔ سہرے بھی لکھے۔ وہ مکتبِ صفیؔ کے ایک عظیم بلند مرتبہ، ماہر عروض داں، وسیع اور عمیق مطالعہ کرنے والے قادرالکلام شاعر تھے۔ وہ بسیار نویس، پُرگو اور زودگو شاعر بھی تھے۔ ان کی اکثر غزلوں میں اشعار کی کثیر تعداد ملتی ہے بلکہ بعض بعض تو دو غزلہ اور سہ غزلہ کے زمرے میں شمار کیئے جا سکتے ہیں۔ ہم قافیہ یا ہم ردیف طویل غزلوں کو علاحدہ علاحدہ منتخب شعروں کی دو غزلوں میں تقسیم کیا ہوں۔ اسی طرح زیادہ اشعار والی غزل میں بھی چند شعر منتخبہ ہی رکھے گئے ہیں۔ تلمیح والے اشعار میں شخصیتوں اور دوسری اصطلاحوں کے بارے میں قدرے تفصیل کے ساتھ آخر میں توضیح و تشریح کی گئی ہے تاکہ اہلِ ذوق اور متجسس ذہنوں کی تشنگی بجھے اور نئی نسل ان معلومات سے بہرہ مند ہو ورنہ عہدِ ماضی کے کسی بڑے شاعر کے بارے میں صرف اتنا لکھ دیا جاتا کہ "فلاں ایران کا بڑا شاعر گزرا ہے" تو بات تشنہ ہی محسوس ہوتی اور ذہنی تشفی حاصل نہ ہوتی۔ بہرحال میں نے ترتیب و تدوین کے اس دشوار ترین کام کو اپنی استعداد کے مطابق حتی الوسع پورے کلام کا احاطہ کرتے ہوئے خوب سے خوب تر انداز میں پیش کرنے کی سعیِ ناتمام کی ہے۔

ع شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے کے مصداق مجھے خوف ہے کہ میرے ساتھ بھی ایسا ہو لیکن مجھے اپنی رسوائی کا اتنا خوف نہیں جتنا استادِ محترم کی روح سے شرمندگی کا ہے۔ استادِ محترم کے مزاج اور اپنے ذوقِ شعری کے

یالاتِ حادی
عتبار سے توقع ہے کہ انشاء اللہ مجھے ندامت نہ ہوگی۔ میری کمزوریوں اور
فزشوں کے باوجود اگر اسے بنظر استحسان دیکھا جائے تو سمجھوں گا کہ میری
نت ٹھکانے لگی۔ اگر کہیں سہو، فروگذاشت اور کوتاہی نظر آئے تو
اکسار کی نااہلی تصوّر فرماکر درگزر فرمائیں تو مشکور رہوں گا۔

استاذی حضرت حادی مغفور نے اپنے مجموعہ کلام کا نام "خیالات
ادی" رکھا تھا اسی لیے اس شعری سرمایہ کو اسی نام سے شائع کیا گیا
ہے۔ اس مجموعہ کلام کے ساتھ جو تصاویر شائع کی گئی ہیں وہ ان کے
احبزادہ نے کینیڈا سے بھیجی تھیں۔ میں ان کے صاحبزادہ عزیزی محمد یحییٰ حامد
احب کو اپنے والد بزرگوار کے دیوان کے محفوظ ہونے کی نشان دہی اور
اتی صرفہ سے اس گراں بہا "علمی ورثہ" اور "شعری سرمایہ" کو شائع کروانے
پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس خاکسار کو
ستاد محترم کے کلام کو مرتب کرنے کا اعزاز فراہم کیا۔ لائقِ ستائش ہیں
وہ سپوت جو اپنے موروثی علمی جواہر پاروں اور تہذیبی ورثوں کے تحفظ اور
شاعت کی وطن سے دُور رہ کر بھی عملی فکر رکھتے ہیں اور ان سے غافل نہیں رہتے۔

میری درخواست پر زبان وادب اور شعر وسخن پر عبور رکھنے والی جن
شخصیتوں نے اپنی قلمی کاوشوں سے حضرت حادی کی حیات اور شاعری پر
ہم نے مضامین عنایت فرمائے ان سب کا فرداً فرداً تہہ دل سے شکریہ ادا
کرتا ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کے حسن اور ادبی افادیت میں اضافہ فرمایا۔

آخر میں اس خوش گوار فریضے کی ادائی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ میں
س مجموعہ کلام "خیالاتِ حادی" کی کتابت کے لیے جناب محمد عبد الرؤف صاحب
خوش رقم اور سرورق کی زیبائش اور نکھار کے لیے ملک گیر شہرت کے
حامل دکن کے مایہ ناز شہرہ آفاق فن کار جناب سلام صاحب خوشنویس و
نیز سرورق پر تصویر کشی کے لیے آرٹسٹ جناب [illegible] صاحب کا شکر گزار
ہوں کہ انہوں نے کتاب کو سنوارنے میں تعاون کیا۔ دائرہ پریس اور

حفیظیہ بک بائنڈنگ چھتہ بازار بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ کتاب کی طباعت اور جلد بندی میں وعدہ کی تکمیل کی۔ اسی طرح تصاویر کی عکس کشی کے لیئے شریف صاحب پیرو پیرا آرٹ پاکیزہ اسٹوڈیو (یاقوت پورہ) کا بھی شکریہ۔

فقط

محبوب علی خاں اخگر قادری
(مُرتب)

مورخہ یکم مئی ۱۹۹۲ء

٥ "نصیب منش" ۲/۱۷/۲۶۲-۳-۱۹
٥ جہاں نما۔ حیدرآباد ۲۵۳..۵



الحاج محمدؐ یحییٰ خالد ابن حضرت غلام علی حاؔدی مرحوم

ضروری بات اور اظہارِ تشکر

جب میں اس عالمِ بے ثبات میں عدم سے وجود میں آیا اور زندگی کی پہلی سانس لی اس وقت میرے والد حضرت غلام علی حادی مغفور تلاوتِ کلامِ پاک میں مصروف تھے اور تنزیل کی آیت وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ○ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ط كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ [سورۃ الانعام آیت ۸۵ و ۸۶ ۔ اور ہم یوں بدلا دیتے ہیں نیک کام والوں کو ۔ اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو ۔ سب ہیں نیک بختوں میں] یا آیت مبارکہ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ○ [سورۃ المریم آیت ۷ ۔ اے زکریا! ہم تجھ کو خوشی سناتے ہیں ایک لڑکے کی جس کا نام یحییٰ ۔ نہیں کیا ہم نے پہلے اس نام کا کوئی ۔] زیرِ ناظرہ تھی اسی لیے اس حقیر پُر تقصیر کا نام محمد یحییٰ رکھا اور عرف یا تخلص کے طور پر خالد سے موسوم فرمایا۔ فطرتاً علم ریاضی سے رغبت تھی اور اسی مناسبت سے سیول انجینیرنگ کی تعلیم حاصل کی۔ شعر و سخن سے طبعاً دلچسپی ضرور رہی، کبھی کبھی چند شعر موزوں بھی کر لیے لیکن اس وادی میں زیادہ دن سفر نہ کر سکا اور شاعر بننے کی بجائے انجینیر بن گیا ۔ حج کے لیے والد کے اضطراب و بے چینی کو دیکھ کر ان کی پس انداز شدہ ناکافی رقم میں اپنی ادلیں کمائی مجتمع کر کے ۱۹۶۷ء میں سفرِ حج کا انتظام کرنے کی حقیر خدمت انجام دی۔ مدینہ جانے انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے بارگاہِ نبوی میں کیا کیا دعائیں مانگیں تھی کہ اللہ کے فضل و کرم سے دوسرے ہی سال یعنی ۱۹۶۸ء میں اس عاجز کو حج کی سعادت نصیب ہوئی اور ان کی دعاؤں کے طفیل ایک سال مکۂ معظمہ میں اور چودہ سال مدینہ طیبہ میں ملازمت کر کے راہی امریکہ ہو گیا اور اب کینیڈا میں

مقیم ہوں۔

آغوشِ مادری بہت کم سنی میں چھن گیا اور گردشِ روزگار نے والد کی خدمت گزاری سے بھی محروم کر دیا۔ دیوان طبع کروانے کی غرض سے کتابت کا آغاز کر دیا ہی تھا کہ اس کام کو معلّم عبیدیؔ کے سپرد کر کے مدینہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ جو میرے والد سے واقف بھی تھے اور ان سے اچھی ملاقات بھی تھی۔ وہاں سے کینڈا چلے جانے کی وجہ سے یہ کام معرضِ التواء میں پڑ گیا اور اسی دوران معلّم عبیدی بھی چل بسے۔ وطن سے دُور رہنے کے قطع نظر میں اپنے آپ کو کلام کے مرتب و مدون کرنے کے اہل نہیں پاتا۔ معلّم عبیدی کے انتقال سے رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔ پہلے خط کے ذریعہ پھر تذکرہ "تلامذہ صفیؔ" پڑھنے پر علم ہوا کہ یہ امانتی شعری سرمایہ تلف ہو گیا۔ میں نے بغیر کسی تاخیر کے محترم جناب محبوب علیخاں اخگرؔ صاحب کو مطلع کیا کہ وہ میرے چچا کے گھر سے مجموعہ کلام کی دوسری نقل حاصل فرما کر کلام کی ترتیب و اشاعت کا کام اپنے ذمہ لیں اور ان سے درخواست کی وہ اس سے انکار نہیں فرمائیں گے۔ میری دانست میں ان کے علاوہ کوئی اور موزوں ترین اور اہل شخصیت نظر نہیں آتی جو اس کام کو کما حقہٗ شخصی توجہ سے حُسن و کمال کے ساتھ انجام دے سکے۔ "بزمِ تلامذہ صفیؔ" کے سابق معتمد اور میرے والد بزرگوار جانشین حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے چہیتے شاگرد دھن کے پکے، قول کے سچے، مستعد اور قابل شخصیت کا مل جانا میرے لیے بڑی خوش بختی کی بات ہے۔ انہوں نے میرے التماس کو قابلِ اعتنا سمجھا اور شرف قبولیت سے نوازا یہ ان کا کرم، مہربانی، عنایت، نوازش! پانچ حرفی رسمی لفظاً "شکریہ" کہنے یا لکھنے سے رسمِ دُنیا اور ظاہری اخلاق کا اظہار تو ضرور ہو جائے گا لیکن حقیقی معنیٰ میں میرے دل کی گہرائیوں میں اُمڈنے جذبات کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی ہرگز نہ ہو سکے گی کیوں کہ اس کے اظہار کے لیے میرے یہاں الفاظ نہیں ہیں۔

یہ میرے لیے باعثِ سعادت اور والدین کی اخروی خوشنودی کا سبب ہے کہ خُدائے بزرگ و برتر نے مجھے "خیالاتِ حادیؔ" کو اپنے ذاتی صرفے سے

شائع کرنے کا موقع عطا فرمایا۔ اگر عمِ محترم جناب محبوب علیخان اخگرؔ اس ذمہ داری کو قبول نہ فرماتے تو اس مجموعۂ کلام کے زیورِ طبع سے آراستہ ہونے کے امکانات موہوم ہوجاتے اور شعر و ادب کی دنیا مکتبِ صفیؔ کے بالغ نظر، ماہر عروض داں اور وسیع معلومات رکھنے والے دکن کے اہلِ زبان، بلند فکر سخنور کے "خیالاتِ حاوی" سے محروم رہتی! فی الجملہ یہ کہ میرا دلی ہدیۂ تشکر ان کی نذر ہے جس کے لیے میرے محدود دائرہ علم میں لفظوں کا کال ہے۔ اسی طرح اس مجموعۂ کلام میں شامل گراں قدر افکار و خیالات سے مزین مضامین کے لیے ہم عصر شعراء اہلِ فکر و دانش اور متاخر قلمکاروں کی خدمت میں نیاز مندانہ شکر گزاری پیش ہے۔

بڑی ناسپاس گزاری ہوگی اگر میں جناب خواجہ معین الدین عزمی صاحب کا اسمِ گرامی نہ لکھوں جنھوں نے اپنے مکتوبات کے ذریعہ کتابت اور طباعتی مراحل سے آگاہ فرماتے رہے اور اپنے غیر معمولی مفید مشوروں سے نوازا نیز عمِ محترم اخگرؔ صاحب کے ساتھ ان کا دستِ تعاون ہمیشہ شامل رہا۔ باوجودیکہ وہ اُس زمانے میں خرد سال طالب علم تھے لیکن وہ مولانا عبد الباقی شطاری رحؒ، ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی، میرے والد حضرت حاویؔ اور دیگر شعراء حضرت جوہرؔ، یقینؔ، یکتاؔ، یوسفیؔ، حامیؔ، ناوکؔ، خیالیؔ، مسلمؔ وغیرہ کی علمی، ادبی اور شعری نشستوں میں موجود رہتے تھے اور ان سب کے قدر دانوں میں سے ایک ہیں۔ میں اولاً مکرر جناب اخگرؔ صاحب محترم اور ثانیاً جناب عزمی صاحب مکرم اور جناب نظیر علی عدیلؔ صاحب کی خدمات میں ان کے اخلاص و مودت اور ترتیبی اور اشاعتی کام میں مخلصانہ کاوشوں اور مساعی جمیلہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں جزاکم اللہ خیر الجزا۔ میں آخر میں والد کے ان شعروں پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

یہ سب نمود و نام ہے ان کے کرم کے ساتھ ؎ ورنہ مرا وجود کہاں اس بھرم کے ساتھ
مرنے کے بعد ان کا رہتا ہے نام زندہ ؎ لیتے ہیں زندگی سے جو کام زندگی کا

محمد یحییٰ خالد
دوراُفتادہ ... اونٹوریو۔ کینڈا۔

حضرت حاوؔی حیدرآبادی

[از محمد یوسف الدین ابو العلائی مرحوم سب ایڈیٹر روزنامہ رہنمائے دکن]

(محترم یوسف الدین صاحب ابو العلائی مرحوم نے یہ مضمون میرے استاد محترم حضرت حاوی کے انتقال کے بعد سپردِ قلم کیا تھا جو روزنامہ رہنمائے دکن ۲۵ رمارچ ۱۹۷۰ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا جو پیش ہے) (مرتب)

دکن کے اہلِ زبان عظیم المرتبت اُستادِ سخن حضرت غلام علی حاوی کے سانحہ ارتحال سے اردو زبان اور اردو شاعری کو زبردست نقصان پہونچا ہے اپنے تخلص کی طرح وہ شاعری کی تمام اصناف پر حاوی تھے فن عروض پر وہ سند مانے جاتے تھے اُن کے انتقال سے فن عروض کی آخری صف اُٹھ گئی۔
حضرت صفی اورنگ آبادی کے جانشین کی حیثیت سے موصوف اپنی زندگی تک دکن میں داغ اور کیفی کے مکتب کی نمائندگی کرتے رہے۔ فکر و فن اور زبان و بیان کے اسلوب اِن کی شاعری کی خصوصیات ہیں ان کا کلام علمی اور مسائلی اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتا ہے بلند پایہ نثار اور عظیم المرتبت شاعر تھے۔ زندگی اور اُس کے مسائل پر گہری نظر تھی جو اُن کے کلام سے ظاہر ہوتی ہے۔

علم و فن کے اس بلند مقام پر پہونچنے کے باوجود طبیعت میں فروتنی عجز و انکسار تھا دکن کی مٹی سے پیدا ہوئے تھے اس لیے نام و نمود سے سخت نفرت تھی۔ تعلیم اور تعلم کے بارے میں فیاض تھے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے منصف مزاج تھے۔ اُردو زبان کے مخلص خدمت گزار تھے۔ عربی اور فارسی کے شاعروں کا گہرا مطالعہ کیا تھا اُن کے کلام کے رموز و نکات سے واقف تھے۔ حضرت کے مقام آگہی کے تمام ہم عصر اساتذہ معترف رہے ۲۷ رجمادی الآخری ۱۳۱۷ھ میں حیدرآباد کے ایک محلہ چھاؤنی غلام مرتضیٰ کمندان میں پیدا ہوئے حضرت سید عمر صاحب قادری نے غلام علی نام رکھا ان کے والد مولوی عباس علی صاحب

یم شیخ صدیقی تھے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم ایک گوشہ نشین بزرگ سے پائی جو مسجد جلو خانہ کے پیش امام تھے انجمن حسامیہ کے توسط سے مولوی کا امتحان کامیاب کیا مولانا محمد جعفر صاحب قبلہ مرحوم اور مولانا مفتی رحیم الدین صاحب رح سے علوم متداولہ کی کتابیں پڑھیں فارسی اور عربی علوم کی تکمیل حضرت مولانا عبدالباقی شطاری کی نگرانی میں کی پنجاب اور مدراس سے منشی فاضل کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا۔

۱۲ر جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ کو حضرت سید محمد بادشاہ حسینی صاحب قبلہ کے ہاتھ پر بیعت کی بیعت سے پہلے حضرت کے ساتھ کھیل کود میں شریک رہے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ یہ میرے بچپن کے ساتھی ہیں۔

نظامت صرف خاص، امور مذہبی، صدر محاسبی اور خزانہ عامرہ میں ملازم رہے ۱۹۵۴ء میں خزانہ عامرہ موتی گلی سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے ابتداء میں یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد کی پیشی کے خوش نویس بھی رہے ۱۳۳۷ھ میں پہلی مرتبہ میر بہبود علی صفی نے انھیں اُستاد حضرت کیفی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس وقت اُن کی عمر بیس سال تھی کلام سننے کے بعد حضرت کیفی نے فرمایا ہمارے پاس ایک تخلص ہے حاوی۔ ہے تم لے لو اس تخلص کی مناسبت ہی سے وہ لفظی تحقیق پر حاوی تھے اس طرح سترہ اور بیس سال کی عمر کے درمیان حاوی صاحب حضرت صفی سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اُن کے (۵۰) سالہ ساتھی اور استاد بھائی میر بہادر علی جوہر کا بیان ہے کہ حاوی صاحب بہت جلد اصلاح سے بے نیاز ہو گئے لیکن اپنے استاد کی زندگی تک ان کی خدمت میں اپنا کلام اصلاح کے لیے پیش کرتے رہے حالانکہ صفی صاحب نے اپنے کئی فنی متوسلین کو ان کے تفویض کردیا تھا۔ حضرت صفی انھیں مولوی کے نام سے پکارا کرتے تھے یہ عمر میں اپنے اُستاد سے سات سال چھوٹے تھے انتہائی ذہین اور طباع تھے

حافظہ قوی اور علم حاضر تھا مختلف علوم و فنون پر محققانہ نظر رکھتے تھے۔ ایک ہی نشست میں غزل کہتے اور بہ یک نظر غزل کی اصلاح کرنے کے عادی تھے۔ حضرت کیفی پر ایک مقالہ ساتنا ارشاد میں بھی ایک ہی نشست میں سپرد قلم کیا تھا جو بزم جیون کے ادبی اجلاس میں پڑھا گیا حضرت شاہ قادری کے دیوان "سبع ایچ" کے عنوان سے ایک مقدمہ تحریر کیا ہے جس کو اُن کی نثر کا شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔

حیدرآباد کے ایک مذہبی رسالہ ارشاد میں صنائع بدائع پر اُن کے مضامین بھی شائع ہوتے رہے ہیں (غزل اور اس کا بانکپن) کے موضوع پر موصوف نے ایک تحقیقی مضمون بھی تحریر کیا تھا۔ اردو زبان کا یہ عظیم المرتبت شاعر شنبہ ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ کی رات کے (۱۱) بجے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا گزشتہ ایک سال سے وہ صاحب فراش تھے۔ خون کا دباؤ اور فالج جیسے عوارض میں مبتلا تھے دوسری بیوی کے انتقال کے بعد ۱۹۶۳ء سے اپنے چھوٹے بھائی صابر علی شاکر کے ساتھ تھے ان کے صاحبزادے محمد یحییٰ خالد مدینہ طیبہ میں انجینئر ہیں۔

نوٹ: اس مضمون کی نقل جناب عبدالعلی شاہ ساجد عرفانی، تلمیذ جناب عدیل نے جیٹ گوپہ سے ذریعہ ٹپہ روانہ فرمائی، جس کی تصدیق میں نے لائبریری عثمانیہ یونیورسٹی میں محفوظ شدہ اخبار "صدائے دکن" سے کی۔ اس تعاون کے لیے میں موصوف کا شکر گزار ہوں۔

(مرتب، اختر)



ڈاکٹر اشرف رفیع
صدر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی

خیالاتِ حادی

ایک تعارف

صفی اورنگ آبادی کے عزیز شاگرد اور جانشین غلام علی حادی اردو، عربی اور فارسی زبان و ادب پر حاوی تھے۔ انھوں نے عربی اور فارسی میں بھی شعر کہے ہیں۔ اُردو میں ان کے شاعرانہ تبحّر کو دیکھ کر رضی الدین حسن کیفی، استادِ صفی نے "حادی" تخلص عطا کیا تھا۔ حادی کو صفی عطیۂ استاد سمجھ کر بہت عزیز رکھتے تھے۔

حادی نے جس زمانے میں شاعری کی طرف توجہ کی، یہ وہ زمانہ تھا جب حیدرآباد میں دو دبستانوں کے شعری دھارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ لکھنوی روایات کی نمائندگی علامہ نظم طباطبائی، جلیل مانک پوری، فانی بدایونی اور ضامن کنتوری کر رہے تھے تو دوسری طرف داغ کے شاگردوں میں کیفی، دبستانِ دہلی کے سرخیل بنے ہوئے تھے۔ کیفی کے شاگردوں کی طویل فہرست میں صفی وہ شاگرد ہیں جنھوں نے اپنی عظمتِ سخن سے استاد کے نام کو سربلند کیا اور دکن کے زبان و بیان کو وقار عطا کیا۔

غلام علی حادی، گلستانِ صفی کے گل سرسبد ہیں۔ تقریباً نصف صدی ان کی عمر شعر و سخن میں گزری۔ وہ ایک پُرگو شاعر تھے اور انہوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ حمد، نعت اور منقبت وہ تبرکاً نہیں بلکہ طبیعتاً کہتے تھے۔ حمدِ باری میں حادی نے ثنائے جمیل یعنی اسمائے حسنیٰ اور

صفاتِ الٰہی کی تعریف ہی نہیں کی بلکہ اپنے قلب کی گہرائیوں سے ذاتِ باری کا احساس بھی کیا ہے۔ فکر و دانش کو وہ بھی چراغِ رہگذر سمجھتے ہیں اس لیے دُعا کرتے ہیں ؎

عذاب ہے مری دانش تو کر عطا مجھ کو
وہ بے خودی جو دلیلِ نجات ہے ساقی

نعت کہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ شاعر عشقِ نبی کریمؐ سے سرشار ہو تاکہ اپنے قلبی واردات اور دلی کیفیات کا شایانِ شان اظہار شاعری میں کر سکے عام طور پر نعت گو شعراء نے بارگاہِ رسالتمآب میں اپنی محبت اور عقیدت کے پھول پیش کئے ہیں لیکن حاوی کی نعت گوئی عام ڈگر سے ہٹ کر عرفانِ رسول عربی کا موثر اظہار ہے جس میں احادیث و آیات سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اگر حضرتِ حاوی اپنے آپ کو صرف نعت گوئی کے لیے وقف کر دیتے تو غزل گو سے زیادہ اچھے نعت گو ثابت ہوتے نعتیہ کلام میں ان کے شاعرانہ کمال اور ندرتِ خیال کے بہترین نمونے ملتے ہیں:

قدِ بے سایہ لے کر آپ آئے
مٹے سب ظلمتوں کے تھے جو سائے

جب نفیٔ مثل ہے لیس کمثلہ
کس منہ سے نام لے کوئی ان کی مثال کا

دلیلِ عظمتِ نامِ نبی ہے کلمۂ طیب
جو الا اللہ کے ہمراہ ہے عطفِ امانت سے

ظہورِ جلوۂ بے صورتی خود عینِ صورت ہے
مرے سرکار کو دیکھو اگر چشمِ بصیرت ہے

مقامِ "لی مع اللہ" اللہ اللہ!
فرشتوں سے جہاں پہنچا نہ جائے

تلاوت میں ہے نصِّ قابَ قوسین
تصور میں ہیں ابروئے محمدؐ
حق سے واصل، خلق میں شامل، انسانوں میں فردِ کامل
آپ موخر، آپ مقدم، صلی اللہ علیہ وسلم

حاوی صوفی سے زیادہ صوفی منش تھے۔ ان کی غزلیں، ان کے متصوفانہ رنگ کی غماز ہیں:

دونوں جگہ ہیں آپ مکاں ہو کہ لامکاں
ننگِ وجود ہم جو بنے تو کہاں رہے
مجھے سجدے کی دعوت دے رہا ہے
ہر اک ذرّہ کسی کے آستاں کا
یہ کیسی وسعتِ دل اللہ اللہ!
مکاں پر حُسنِ ظن ہے لامکاں کا
دل حائلِ انا ہے، انا ہے محلِ علم
سادہ سا یہ ورق ہی مکمل کتاب ہے

حاوی صاحب نے فقہ، منطق اور معقولات کی تعلیم مولانا عبدالباقی شطاری سے حاصل کی تھی۔ مولانا عبدالباقی شطاری ایک عالم بے بدل اور صوفیٔ سالک تھے۔ ان کے در پر جس طالب علم نے جبہہ سائی کی وہ کچھ لے کر اُٹھا۔ حاوی کو یہاں سے دولت دین کے ساتھ حیات و کائنات کے فہم و ادراک کی روشنی بھی ملی۔ حاوی نے اپنے کلام کے ذریعے اخلاقی اور مادی کثافتوں سے دامن بچا کر رُوح کو تاب و توانائی دینے پر زور دیا ہے کیونکہ روحانی ارتقاء میں انسان کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ اس کی خود فریبی اور اخلاقی پستی ہوتی ہے۔ ان کے یہاں شاعری میں اخلاق اور حکمت کے مسائل بھی کثرت سے ملتے ہیں اور لطف یہ

ان میں طنزِ ملیح اور قلندرانہ رنگ بھی ہے ؎

اوقات ہو رہی ہے فرشتوں کی بھی خراب
لکھتے ہیں جو حساب ہمارے گناہ کا

اب تو ہر ایک اپنا پرایا ہے بار یاب
اس میں قصور کیا ہے زلیخا کی چاہ کا

اس میں کوئی شک نہیں کہ حاوی کا طرزِ فکر اور اسلوبِ بیان، اپنے عہد کی روایات کا آئینہ دار ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے اندر کا شاعر روایتی حدبندیوں سے باہر جھانکتا بھی نظر آتا ہے جس زمانے میں انہوں نے یہ اشعار کہے ہیں، اس وقت ان کا لب و لہجہ ان کے معاصرین میں منفرد اور زاویۂ فکر تیکھا نظر آتا ہے ؎

ہم ٹال بھی سکے نہ ذرا دل کی بات کو
فرمان ماننا ہی پڑا بادشاہ کا

ایسا پڑا ہے کال کہ جینا وبال ہے
برسات دُھن کی تھی کبھی ہندوستان پہ

وہ مسافر ہوں میں اپنے شہر میں
جس کا کوئی پوچھنے والا نہیں

حُسن و عشق، اردو غزل کا خاص موضوع ہے جس سے کسی شاعر کو، خواہ وہ فکر و آگہی کی کسی منزل میں ہو، مفر نہیں۔ اس کا عشق اسی کے اپنے مقام سے ہے۔ حضرت حاوی کے یہاں بھی مضامینِ حُسن و عشق بکھرے پڑے ہیں جن میں حقیقت اور مجاز آنکھ مچولی کھیلتے نظر آتے ہیں۔ ایسے اشعار میں بے باکی، لذت کوشی اور بے راہ روی نہیں ہے۔ حاوی کی غزل میں رنگ دلوں کے معاملاتِ شعری کا سراغ ملتا ہے۔ دردِ محبت کی کسک، نشتریت اور خلش ملتی ہے۔ اظہارِ محبت میں وہ دفور

جذبات کا طوفان نہیں بلکہ ایک سیلِ سبک سیر ہے حاوی کی شاعری میں جدتِ فکر و نظر کا پہلو غالب ہے قافیہ پیمائی انھیں پسند نہیں ہے

حاوی اسی کا قافیہ پیمائی نام ہے
جس شاعری میں جدتِ فکر و نظر نہیں

ان کے بیان میں صفی کی طرح سادگی و پرکاری ہے۔ اندازِ بیان میں تازگی اور طرفگی ہے حاوی نے ردیفوں کے انتخاب سے بڑا کام لیا ہے۔ ردیف نہ صرف خیال کی ترتیب میں مدد دیتا ہے بلکہ تجربہ کے اختصاص کو تعمیم میں بدل کر شعر کو زیادہ قابلِ قبول بنا دیتی ہے۔ حاوی کی منتخبہ ردیفیں، تجربے کی تمام جہتوں کو ایک مربوط اکائی کی شکل میں پیش کرتی ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار بطور مثال پیش ہیں:

خود مٹنے کو بنتا ہے ہر اک نقشِ تمنا
رفتارِ زمانہ سے مٹایا نہیں جاتا

بات کیا تھی، کیوں ٹکا سا دے دیا مجھ کو جواب
میں نے تجھ سے ہاتھ پھیلا کر تو مانگا کچھ نہ تھا

دل آپ ہی ہوتا ہے تمنا کا محل بھی
پھر آپ ہی کہلاتا ہے معمارِ تمنا

اب کوئی آرزو نہیں، جز آرزوئے دوست
ہے گفتگو یہی کہ رہے گفتگوئے دوست

حاوی کی اکثر غزلیں ردیف کے انتخاب سے غزلِ مسلسل بن گئی ہیں جس کی مثالیں خیالاتِ حاوی میں مل جاتی ہیں۔

انداز بیان کا جو پہلو صفی اور شاگردانِ صفی کی پہچان بن گیا ہے وہ ہے اس کی سادگیٔ زبان، روزمرہ اور محاورہ کا برجستہ استعمال اور مقامی لب و لہجہ جس نے اس کو نئی جِلا بخش دی ہے:

کبھی تولہ، کبھی ماشہ، گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ
کوئی کیا خاک اندازہ کرے ان کی طبیعت کا

احسان آج مانئے اپنی نگاہ کا
اب کل کے روز منہ نہ رہا دادخواہ کا

دن پھریں گے کبھی ہمارے بھی
بس یہی اک سوال ہے اپنا

حاؔدی کے بعض اشعار پر صؔفی کا گمان گزرتا ہے :

آپ کو فرصت کبھی ملتی نہیں !
آپ کر سکتے بھی ہیں فرصت سے کام

جو جگہ جس کو ملی، جیسی ملی، اچھی ملی
تیری محفل میں کسی کی عزت و توقیر کیا

تو لاکھ بار دولت دیدار کر عطا
بھرتی نہیں غریبوں کی نیت کسی طرح

تو مکتب صفی کی نمائندگی نہ چھوڑ
حاؔدی رہے غزل کے لیے کوئی سی طرح

حاؔدی کے شاگرد، جناب محبوب علی خاں اخگرؔ نے حضرت حاؔدی کا منتخب کلام "خیالات حاؔدی" کے عنوان سے مرتب کر کے اردو والوں کو سرزمین دکن کے ایک جوہر قابل سے متعارف کروایا ہے۔ ان کے اس جذبۂ عقیدت مندی کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔

پروفیسر اشرف رفیع
صدر شعبۂ اردو۔ عثمانیہ یونیورسٹی



سید نظیر علی عدیلؔ تلمیذ حضرت صفیؔ اورنگ آبادی

"زندہ و باقی ہیں حاوی"

(حضرت غلام علی حاوی کی شخصیت و شاعری)

ذوق و غالب کا موازنہ کرنے والے کہتے ہیں کہ ذوق استادِ بہادر شاہ ظفر تھے اس لیے غالب کے مقابلے میں زیادہ وقیع نظروں سے دیکھے جاتے تھے ورنہ غالب میں جو ندرتِ فکر و بیان اور دور کی کوڑی لانے والی خصوصیات تھیں وہ ذوق میں نہیں تھیں۔ اسی بات کو صرف عقیدت اور وہ بھی اندھی عقیدت کا نام دیا جا سکتا ہے ورنہ ایمان دارانہ تقابل کیا جائے تو واضح ہوگا کہ غالب نے صرف مضمون آفرینی کی ہے، زبان کی کوئی خدمت نہیں کی۔ اس کے برخلاف ذوق نے اردو زبان کو اردو زبان بنایا اور اس کو اتنا فروغ دیا کہ اس دور میں بھی ذوق کی ہی زبان بولی جاتی ہے۔ ذوق کے اس مسلک کو ان کے تلمیذِ رشید حضرت داغ دہلوی نے اور آگے بڑھایا، نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا ؎

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

داغ کے بعد ان کے ایک حیدرآبادی جانشین حضرت رضی الدین حسن کیفی نے جو بعد میں ملک گیر سطح پر داغ کے جانشین تسلیم کیے گئے، مسلک ذوق کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا اور داغ کے منہ میں منہ ڈال کر ایسی زبان میں شعر کہے کہ ذوق کی روح وجد کرنے لگی ہے۔ حضرت کیفی کے بعد ان کے جانشین حضرت صفی اورنگ آبادی نے تو نہ صرف مسلک ذوق کی والہانہ پیروی کی بلکہ اس میں ایک اجتہاد بھی کیا، وہ یہ کہ شاعری میں

ذوق کا لب و لہجہ اور محاورہ بندی کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں دکنی بول چال اور دکنی محاوروں کا بھی اضافہ کیا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ان کو شاعروں میں وہ مقام حاصل ہوگیا جو پیمبروں میں حضرت آدم صفی اللہ کو حاصل تھا۔ حضرت صفی کے تلامذہ کی تعداد سیکڑوں پر مشتمل ہے درجہ بندی کے لحاظ سے ان کے دورِ اولیٰ کے تلامذہ میں حضرت غلام علی حاوی کو خصوصیت اور بڑا مقام حاصل ہے۔ بہ الفاظ دیگر حضرت صفی کے انتقال کے بعد سلسلہ ذوق اگر بند نہیں ہو جاتا تو اس کی وہ آب و تاب بھی نہ رہتی اگر حضرت حاوی نے ان کی مسند نہ سنبھال لی ہوتی۔ حضرت حاوی کے ہم عصر تلامذۂ صفی میں عبدالحمید خاں خیالی، لیاقت علی سیف، یاور علی خنجر، احمد علی پیکاں، بہادر علی جوہر، حامی مصلی، یوسف علی خلوص، فخرالدین عالی، حافظ ابونعیم عیش، شیخ محمد باہر تیز اور سید غوث یقینی قابلِ ذکر ہیں لیکن ان میں حضرت غلام علی حاوی بقول حضرت صفی "حاوی سب پر حاوی ہے" اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے کیونکہ مذکورہ تمام تلامذہ صرف شاعر تھے۔ ویسے ان کی شعری خدمات گراں قدر ہیں لیکن حضرت حاوی ایک فطری شاعر ہونے کے علاوہ "قادرالکلام اور عروض داں بھی تھے۔ نہ صرف عروض داں تھے بلکہ عروض پر تبحر رکھتے تھے۔ ان کے زبان دانی اور عروض پر تبحر رکھنے کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت صفی اورنگ آبادی نواب ضیا یار جنگ کے پاس منعقد ہونے والے فارسی طرحی مشاعروں کے لیے جب غزل کہتے تو اپنی غزل کا مسودہ حضرت حاوی کو دے کر فرماتے تھے کہ "مولوی ذرا دیکھنا، کہیں زبان و بیان کا جھول تو نہیں رہ گیا ہے"۔ یہ وقت حضرت حاوی کے لیے بڑا صبر آزما اور نازک ہوتا کیوں کہ ہاتھ میں کاغذ استاد کی غزل کا اور معاملہ "گویم مشکل و نہ گویم مشکل" کا۔ کچھ کہتے ہیں تو استاد کے ساتھ سوءِ ادبی کی تعریف میں آتا ہے اور کچھ نہیں کہتے ہیں تو ادبی دیانت کے خلاف قرار پاتا ہے۔ لیکن انہوں نے ادبی دیانت کو سوئے ادبی پر ترجیح دی اور جہاں کہیں استاد کی غزل میں کوئی جھول محسوس کیا اس کا

ہمار کرتے ہوئے اس کا متبادل بھی پیش کر دیا۔ اس سے اندازہ لگایا
سکتا ہے کہ ان کو زبان و بیان اور عروض پر کس قدر تبحر حاصل تھا۔
ن کو زبان و بیان اور عروض پر تبحر حاصل ہو اس کے پاس شعرگوئی کی
میت ہی کیا ہو سکتی ہے وہ ان کے پاس ایک دست بستہ لونڈی
نڈی کی طرح تھی۔ حضرت حاوی نے جامعہ نظامیہ سے مولوی کا
تحان کامیاب کیا [اصولاً مولوی کے امتحان کے بعد منشی فاضل کا
تحان دینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن طبیعت میں تجسس و تنوع
یسا تھا کہ] سنہ ۱۹۳۰ء میں پنجاب جاکر پنجاب یونیورسٹی سے اور سنہ ۱۹۳۱ء
ں مدراس جاکر مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔
عجب نہ تھا کہ السنہ شرقیہ کے امتحانات اگر چین میں ہوتے تو وہ
ہیں بھی جاتے اور امتحان دے کر آتے۔ ان کی اس استعداد علمی کے
اعث ان کے بعض ناقدین کہتے ہیں کہ حضرت حاوی محض علم کے زور
پر شعر کہتے تھے ورنہ وہ فطری شاعر نہیں تھے۔ ناقدین کے نظریات
سے قطع نظر یہ بات کچھ لایعنی سی لگتی ہے کہ شعر علم کے زور پر کہے جا سکتے
ہیں۔ واضح ہو کہ شعرگوئی فطری صلاحیت شعرگوئی پر مبنی ہوتی ہے اور یہ
سی وقت ممکن ہے جبکہ شاعر میں موزونی طبع ہو۔ موزونی طبع کا تعلق
علم سے نہیں بلکہ ٹھیٹ فطرت سے ہے۔ اب اگر اس کا تجزیہ کیا جائے
تو ثابت ہوتا ہے کہ حضرت حاوی فطری شاعر تھے اور علم کے زور پر
شعر میں رنگ آمیزی کر کے اس کو جِلا بخشتے تھے۔ وہ محض علم کے
زور پر شعر نہیں کہتے تھے کیونکہ علم کے زور پر شعر کہنا اگر ممکن ہو تو
کیوں بڑی بڑی ڈگریاں رکھنے والے شاعر نہیں ہوتے؟ کیا یہ ایک
زندہ حقیقت نہیں ہے کہ پروفیسر عبدالقادر سروری، ڈاکٹر محی الدین
قادری، پروفیسر سید محمد، ڈاکٹر حفیظ قتیل ڈاکٹر ابوالنصر خالدی اور
ایسے ہی کئی ڈاکٹریٹ کی ڈگری رکھنے والے شاعر نہیں تھے اور ان کو

اعتراف تھا کہ وہ شعر نہیں کہہ سکتے۔ اب اگر حضرت حادی علوم سے بہرہ ور ہوتے ہوئے اردو، فارسی اور عربی میں شعر کہتے تھے تو ثابت ہوا کہ وہ ایک باکمال فطری شاعر تھے۔

شمالی ہند کے ایک ماہنامہ نگار میں حضرت حادی کی ایک غزل چھپی تو جنوبی ہند کے ایک سرپھرے نے اعتراض کر دیا کہ شعر بہت ثقیل ہیں اور شاعری کے مزاج کے مغائر ہیں اس نے اعتراض بالخصوص اس شعر پر کیا ہے

دل جاہل آنا ہے انا ہے محلِّ علم
سادہ سا یہ ورق ہی مکمل کتاب ہے

اب اس "سادہ لوح" کو یہ کون سمجھاتے کہ جو مضمون شعر میں ہے اس کے اظہار کے لیے اور کون سے الفاظ ہو سکتے ہیں؟ شعر میں چاہے کیسے ہی الفاظ ہوں اگر مضمون سمجھ میں آجائے تو سامع الفاظ کے گورکھ دھندے سے نکل کر مضمون کی لطافت و ندرت پر سر دھننے لگتا ہے۔ یہی حضرت حادی کے کلام کی خصوصیات ہیں کہ وہ روش عام سے ہٹ کر ایسی عالمانہ شان سے غیر عامیانہ الفاظ میں شعر کہتے تھے کہ صاحبان ادراک اور سخن فہم سر دھننے لگ جاتے تھے۔ علامہ اقبال کے کلام میں ایک شعر ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ویسے یہ شعر خود علامہ اقبال پر صادق آتا ہے لیکن اگر کسی دوسرے پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے تو وہ بلاشبہ حضرت غلام علی حادی ہیں کہ وہ ۱۵۔ ذی الحجہ ۱۳۸۶ھ میں رحلت کر گئے۔ اب اگر ان کی طرح دیدہ ور پیدا ہونے کے لیے ہزاروں سال نہیں تو کم سے کم ایک ہزار سال درکار ہیں جو ۲۳۸۶ھ میں پورے ہوں گے تب کہیں پھر کوئی دیدہ ور پیدا ہوگا۔

اپنا یہ مضمون ختم کرنے سے پہلے میں یہ ضرور لکھنا چاہوں گا کہ

ایسے ہمالیہ جیسے قدر رکھنے والے شاعر کے لیے حیدرآباد کے ادبی حلقوں نے کیا کیا؟ کیا کبھی ان کا یوم منایا۔؟ یا ان کے مجموعہ کلام کی اشاعت کا اہتمام کیا؟ اگر کچھ نہیں کیا تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ بے حس ہیں مردم شناس نہیں۔ لیکن خیر بے حسی اور مردم ناشناسی سے حضرت حاوی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا کیوں کہ شاعری کے سفر میں وہ اس منزل پر پہنچ گئے تھے جہاں فنا خود فنا ہو جاتی ہے اور صرف بقا رہ جاتی ہے۔

لیجیے اب حضرت حاوی مرحوم کے چند ایسے شعر مجھ سے سنیے جن کا میں نے انتخاب نہیں کیا بلکہ وہ خود منتخب ہو کر میری یادداشت کی زینت بنے ہوئے ہیں ؎

آپ ایسے اچانک آ پہنچے ۔ اپنی آنکھیں بھی ہم بچھا نہ سکے

میلانِ نگاہ ان کی جانب ۔ اتنے سے جھکاؤ پہ گرا ہوں

قدموں سے اٹھا بیٹھے نہ اپنے ۔ گرنا تھا جہاں وہیں گرا ہوں

یہ زاہد کیوں مراقب قبلہ رو ہے ۔ نظر ہو تو تجلی چار سو ہے

ناخوشگوار وقت کے سانچوں میں ڈھل گئے
دنیا کو جو بدل نہ سکے خود بدل گئے

منصور کو ملی تھی سزا اس قصور کی
کھو کر شعور بات نہ کھوئی شعور کی

کیفیت اس کی آ نہیں سکتی بیان میں
غصے کوئی کے دیکھ یہ کیسی شراب ہے

کسی پہ کھل نہ سکی راہ ان کے آنے کی
سب آنے والے تو آنکھوں سے دل میں آئے ہیں

ہوت اور شے ہے حسن پہ مرنا کچھ اور ہے
وہ زندگی کے بعد ہے یہ زندگی کے ساتھ

جنت کا حسنِ ظن ہے کسی کے مکان پر ۔ مجھ کو خدا معاف کرے اس گمان پر

دینے والا کس قدر ہوگا سخی
مانگنے والا اگر حاتم رہے

غرق ہیں جو خیالِ دنیا میں
کیوں نہ پیاسے رہیں وہ دریا میں

قید معشوق کو کیا اپنے
عیب یہ رہ گیا زلیخا میں

سب سے غرض ہے تم کو ہمیں سے غرض نہیں
دنیا جہاں سے عار نہیں ہم سے عار ہے

اس لیے ہوتی ہے ہر دم کی ملاقات بری
باتوں باتوں میں نکل جاتی ہے اک بات بری

درباں کا کیا اثر ہو بھلا گھر کے چور پہ
پوشیدہ ہیں ضمیر کے دھوکے نگاہ سے

وسوسے بڑھتے ہیں تاخیر سے آنے والے
ہم ہیں پل پل کی تری خیر منانے والے

اور کیا تکلیف پہنچی گردشِ ایام سے
ہم ذرا کروٹ بدل کر سو گئے آرام سے

پانی چرا رہا ہے کوئی زخمِ دل ضرور
ورنہ یہ آنکھ عالمِ رقت میں تر نہ ہو

دخترِ رز منہ نہیں لگتی کبھی
شیخِ نامحرم کے نامحرم رہے

خدائی سے غرض کیا اس گدا کو
خدا سے مانگتا ہے جو خدا کو

مٹی کے ڈھیر میں رہے کیا شانِ احترام
ہے صاحبِ مزار سے رتبہ مزار کا

میں تیرا نام لے کر جی رہا ہوں
زمانہ کام لیتا ہے اثر سے

حیدرآباد کے ادبی حلقوں سے قطع نظر خود ان کے متعلقین کو بھی بہت دیر سے خیال آیا چنانچہ ان کے فرزند محمد یحییٰ خالد نے جو اس وقت کینیڈا میں مقیم ہیں اس طرف توجہ کی اور اپنے والد مرحوم کے مجموعہ کلام "خیالاتِ حادیؔ" کی طباعت و اشاعت میں سرمایہ لگاکر اس کو منظرِ عام پر لانے کا اہتمام کیا۔ اس مجموعہ کلام کے دیگر لوازمات یعنی اس کی ترتیب و تزئین میں ان کے تلمیذ و جانشین جناب محبوب علیخان اخگر نے پوری تگ و دو کی اس طرح ہر دو اصحاب لائق ستائش ہیں۔ میں اس موقع پر حضرت حادیؔ مرحوم کو اپنی طرف سے ایک نذرانۂ شعر پیش کرتا ہوں ؎

ان سے بڑا تو کیا کہ مساوی نہ ہو سکا
حادیؔ کی طرح کوئی بھی حادی نہ ہو سکا

بیت النظیر
مغل پورہ

نظیر علی عدیل

حضرت غلام علی حادیؒ
(جانشین حضرت صفیؔ اورنگ آبادیؒ)

بھاری بھرکم جسم رعب دار چہرہ ستواں ناک اور جھلکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں والی شخصیت جن کے چہرے سے تبحرِ علمی اور آنکھوں سے ذہانت کے فوارے چھوٹتے ہوئے نظر آتے تھے جب بھی کسی محفل میں تشریف لاتے تو بے ساختہ دل کہہ اُٹھتا تھا کہ حادی صاحب حضرت تشریف لا رہے ہیں وہ بسیار گو تھے نہ کم آمیز۔ جس سے ملتے خندہ پیشانی سے ملتے مخاطب ان کا احترام کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا لیکن وہ مخاطب سے مسکراتے ہوئے شفقت کے ساتھ بات فرماتے کبھی اپنی علمیت کا نہ رعب جماتے نہ اپنی سنجیدہ مگر شگفتہ مزاجی کو جانے دیتے محفلوں میں تشریف لاتے تو ان کے ساتھ دو چار احباب ہوتے تھے۔ داد دینے کے معاملہ میں بڑے وسیع القلب تھے بہت کھل کر داد دیتے کبھی یہ نہیں سوچتے تھے کہ شعر سنانے والا کون ہے چھوٹوں کی بڑی ہمت افزائی فرماتے اور کبھی یہ محسوس ہونے نہیں دیتے کہ وہ ان سے کم تر ہے۔

حضرت صفیؔ کے انتقال کے بعد اکثر تلامذہ نے حضرت حادی کو حضرت صفیؔ کا نہ صرف جانشین مانا بلکہ اپنے کلام پر بھی انھیں سے اصلاح لی اور حضرت صفیؔ کے اس قول کو عملاً مان لیا کہ "حادی سب پر حادی ہے" حضرت صفیؔ کی بنا کردہ بزمِ تلامذۂ صفیؔ کی سرپرستی حضرت صفیؔ کے بعد حضرت حادی نے فرمائی جس کا ماہانہ مشاعرہ کبھی طرحی اور کبھی غیر طرحی پابندی کے ساتھ منعقد ہوتا تھا جس میں مختلف مکاتبِ خیال کے شعراء کو مدعو کیا جاتا تھا اور بڑے خوشگوار ماحول میں یہ محفلیں چلتی تھیں۔



خورشید جنیدی تلمیذ حضرت نجم آفندی مرحوم

اس کی ضد پر ایک ادر انجمن "ادبستانِ صفی" کے نام سے قائم کی گئی تھی جس کی سرپرستی حضرت عبدالحمید خاں خیالی فرماتے تھے حضرت خیالی بڑے نیک نفس اور پرخلوص بزرگ تھے بعض مفاد پرستوں نے ان کا اِس درجہ استحصال کیا کہ آخر عمر میں انہیں حکیم محمود الرحمٰن صاحب کے گھر میں پناہ لینی پڑی کیونکہ اُن کے گھر کا شیرازہ بکھر گیا تھا اور ان کا عظیم الشان کتب خانہ دربدر ہو گیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان دونوں بزرگوں یعنی حضرت حادی اور حضرت خیالی کے برادرانہ راہ و رسم میں کبھی فرق نہ آیا حضرت خیالی "تلامذۂ صفی کی محفلوں میں اور حضرت حادی "ادبستان صفی" کی محفلوں میں خندہ پیشانی سے شرکت فرماتے میرے ان دونوں حضرات سے قریبی تعلقات تھے میں نے کبھی اِن میں سے کسی کو کسی کے خلاف کچھ کہتے ہوئے نہیں سنا یہی ایک وصف ان دونوں کی عظمت پر دلالت کرتا ہے میرے ذہن میں آج بھی حضرت خیالی کا ایک شعر محفوظ ہے ؎

خدا انھیں بھی خیالی یہ دن نصیب کرے ✿ سمجھ رہے ہیں جو ماضی کی یادگار مجھے

ان دونوں بزرگوں کے ساتھ مجھے بھی "تلامذۂ صفی"، "ادبستانِ صفی"، "بزم کامل جس کے سرپرست مولانا شیخن احمد صاحب شطاری کامل تھے اور زاویہ ادب جس کے سرپرست حضرت نجم آفندی تھے کے اکثر و بیشتر مشاعروں میں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

برادرم محبوب علی خان اخگر جنھوں نے صفی اسکول کو ثباتِ دوام دینے کا بیڑہ اٹھایا ہے جن کی کتاب "تلامذۂ صفی" نے ادبی دنیا میں ایک نئی روشنی پھیلائی ہے اور وہ اب اصلاحاتِ صفی اور محاوراتِ صفی پر مبسوط دستاویزات پیش کر رہے ہیں۔ حضرت حادی کے کلام کی اشاعت کی بھی نگرانی قبول کی ہے ان کی پرخلوص کاوشوں اور بھائی سخت گیری نے مجھے حضرت حادی پر کچھ لکھنے پر مجبور کر دیا اور ذیل میں حضرت حادی کے چند اشعار جو انھوں نے مختلف مشاعروں میں سنائے ہیں پیش کرنے

کی جسارت کر رہا ہوں۔ چونکہ یہ تیس پینتیس ۲۵ سال پرانے تذکرے
ہو سکتا ہے کہ کسی جگہ میرا حافظہ ساتھ نہ دے قارئین کرام کا
جو صحت واقعات پر مبنی ہو میرے لیے باعثِ تشکر اور
ہو گا ۔

حضرت حاوی نے سچ فرمایا کہ ؎

میں ہوں تنہا اور تنہائی نہیں حاصل مجھے
ہر خیال آتا ہے بن کر آپ کی محفل مجھے

حضرت حاوی نے یہ غزل تلامذہ صفی کے مشاعرہ میں
مطلع کی خوبصورتی نے محفل میں ایک فضا پیدا کر دی اسی غزل
تین اور شعر بھی سُن لیجئے ؎

تجھ سے کیا مانگوں بھلا اے انقلابِ روزگار
ہے وہی مطلوب تھی جو عافیت حاصل مجھے

جائزہ لیتا نہیں کوئی بھی اپنے آپ کا
ناز ماضی پر انھیں اُمیدِ مستقبل مجھے

ایک اور محفل میں اس طرح غزل سرا ہوئے ؎

انسان بے ثبات سہی کائنات میں
ہے ساری کائنات اسی بے ثبات میں

انسان کے بے ثبات ہونے اور اس کی ہمہ جہتی اور ہمہ گیر
کس قدر لطیف انداز میں تبصرہ فرمایا ہے اسی غزل کے مقطع میں
چابکدستی سے ایک فنی نکتہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے ؎

فکرِ سخن میں آپ اچانک جو آ گئے
حاوی روی کو بھول گئے انبساط میں

نواب لطیف الدین خان لطیف آسماں جاہی ادیب نواز و شاعر
شخص تھے ان کے پاس ایک طرحی مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس کے

طرح دی گئی تھی۔

"لطافت دیکھئے اُردو زباں کی"

اس مشاعرہ میں نواب لطیف الدین خاں نے مطلع سُنایا تھا ؎

غزل سُنئے لطیف الدین خاں کی
"لطافت دیکھئے اُردو زباں کی

حضرت حاوی نے مطلع سُنایا ؎

کہوں کیا خوبیاں اُردو زباں کی
نہیں ہے کوئی بولی اتنی بانکی

اور پھر گرہ اس طرح لگائی ؎

مخالف جو ہیں وہ بھی بولتے ہیں
"لطافت دیکھئے اُردو زباں کی"

اسی زمیں میں ایک بے پناہ شعر حضرت حاوی نے سُنایا ؎

قفس سے جب رہائی میں نے پائی
صفائی برق نے کی آشیاں کی

دوسرے مصرع میں پوشیدہ کسک اہلِ ذوق ہی محسوس کر سکتے ہیں۔
بزم کامل کی طرحی محفل میں حضرتِ حاوی یوں غزل سرا ہوئے تھے

سیہ بختی اُجالا زندگی میں لا نہیں سکتی
تو کیا اے روشنیٔ طبع تو کام آ نہیں سکتی

پھر انھوں نے ایک شعر سنایا جو برسوں گزرنے پر آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے ؎

تمنائیں تو بیحد ہیں حدودِ زندگی دیکھو
یہ چادر سے زیادہ پاؤں تو پھیلا نہیں سکتی

کلیانی کے نواب کی ڈیوڑھی میں ایک محفل منعقد ہوئی تھی جس میں حضرت حاوی نے مندرجہ ذیل مطلع پڑھا ؎

قدرت انھیں کو دیتی ہے قدرت بیان پر
غصّے میں بھی جو رکھتے ہیں قابو زبان پر

اسی غزل کا مقطع بڑے دھڑلے سے پڑھا تھا ؎

حاذی زبان کو بھی زباں داں پہ ناز ہے
اہلِ زباں کو ناز اگر ہے زبان پر

صفی سوسائٹی کے مشاعرہ میں حضرت حاذی نے حسبِ ذیل شعر سنایا ؎

اکتفا دل پہ کرے یا مری جاں تک پہونچے
غم کی قوت پہ ہے موقوف جہاں تک پہونچے

اس غزل میں ان کا یہ شعر بھی خوب رہا ؎

قیس و فرہاد کا کیا کوئی بتائے گا مقام
کون پہونچا ہے وہاں تک وہ جہاں تک پہونچے

زاویہ ادب کی محفلوں میں حضرت حاذی نے متعدد مرتبہ شرکت فرمائی تھی ان کے حسبِ ذیل اشعار جو انہوں نے زاویۂ ادب کی مختلف محفلوں میں سنائے تھے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں ؎

ایسی لمبی ہوئی شبِ غم تو نظر میں ہے
کوئی دمِ سحر بھی اُمیدِ سحر میں ہے

اِسی غزل کا ایک شعر ہے ؎

دُنیا تو رہ گزر ہے مگر اس کا کیا علاج
خود راہرو کو وہم اقامت سفر میں ہے

ایک اور مشاعرہ میں انہوں نے یہ غزل سنائی ؎

ساقی جب تک تھا کوئی حاصل مجھے کیا کچھ نہ تھا
اب تو ہوں اس وسوسے میں تھا بھی کچھ یا کچھ نہ تھا

اس لطافتِ فکر کی داد دیجئے ؎

ایک آنسو نے ڈبو یا ضبطِ غم کے نام کو ٭ ورنہ بھر پانی کے آگے تردد یا کچھ نہ تھا

خیالاتِ حادی

ان واقعات سے ماضی کی شاندار روایات کا ایک ہلکا سا مرقع سامنے آجاتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے اساتذہ اور آج کے خود ساختہ اساتذہ میں کیا فرق ہے آخر میں میں اپنے اس مضمون کو حضرت حادی ہی کے ایک شعر پہ ختم کرتا ہوں۔

فرماتے ہیں ؎

اس میں حادی بتانِ ہند تو ہیں
دل ترا سومنات ہو کہ نہ ہو

خورشید جنیدی
۲۳-۲-۱۹۸/الف
مغلپورہ حیدرآباد-۲

۴/۲/۱۹۹۲ء

"حضرت حادی قدیم طرزِ اظہار کے اُستادِ سخنور"

مولوی غلام علی حادی جانشین حضرت صفی اورنگ آبادی سے میرا تعارف ۱۹۶۷ء میں معلم عبیدی الکثری نے کروایا استادِ سخن حضرت علامہ عبدالغفار رشق حیدرآبادی جانشین حضرت رح بھی موجود تھے۔ کسی بھی شعری مجموعہ کی اشاعت اس بات کی مظہر ہے کہ شاعر کے پاس اتنا شعری اثاثہ اعتماد اور شعور موجود ہے کہ وہ اپنی شعری کاوشوں کو مجموعہ کی شکل میں دوسروں کے سامنے نہ صرف پیش کرے بلکہ داد بھی چاہے ہے ــــ

لیکن صرف مجموعوں کی اشاعت ہی شاعر کی اہمیت اور صلاحیت کی کسوٹی نہیں ہوتی دکن میں آج بھی کئی باصلاحیت اساتذہ سخن اور ماہرانِ علم و فن کی قابلِ لحاظ تعداد ایسی ہے جن کے کوئی مجموعے شائع نہیں ہوئے ہیں۔ اس میں کچھ تو حالات مانع رہے اور کچھ تساہل اور فطری طور پر نمود و نمائش سے دوری تھی، حضرت غلام علی حادی بھی انہی شاعروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں اپنا شعری مجموعہ ترتیب تو دے لیا لیکن اس کی اشاعت سے تغافل برتا ــ اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔

مولوی غلام علی حادی قدیم کلاسکی روایتی طرزِ اظہار کے نمائندہ اور استاد سخنور تھے ان کے منتخب کلام کے مطالعے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان کے پاس کہنے کے لیے ہر موضوع پر وافر مواد اور الفاظ کو سلیقے سے گرفت میں لینے اور اظہار کو زیادہ سے زیادہ فنی، جاذب اور پُر تاثیر بنانے کا فن بدرجۂ اتم موجود تھا۔

حالانکہ اُنکی حیات ہی میں ترقی پسند تحریک اور جدید شاعری اپنے جدید علائم کے ساتھ متحرک ہو چکی تھی لیکن عصری حیثیت اور علائم انھیں کلاسکی ڈگر سے ہٹا نہ سکے اور اُن کا رشتہ صحراؤں اور سمندروں کی بجائے اپنے محسوسات اور تجربات اپنے شہر اور اپنے گاؤں سے ہی زیادہ استوار تھا۔ ان کی غزلیں قدیم احساس اور طرزِ احساس سے دو آتشہ ہوگئی ہیں۔



ڈاکٹر راہیؔ

انھوں نے اپنے اُستادِ سخن حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کے علاوہ کسی اور سخنور سے اثرات کو قبول نہیں کیا، اور اپنی انفرادی لئے کو نہ صرف دائم و قائم رکھا بلکہ کہیں بھی اُسے مجروح نہیں ہونے دیا۔

قابلِ مبارکباد ہیں شاگردِ رشید محبوب علی خاں اخگرؔ اور حضرت حادیؔ کے فرزندِ دلبند یحییٰ خالد جنھوں نے "خیالاتِ حادیؔ" کی اشاعت کو اپنی کاوشوں اور صلاحیتوں سے یقینی بنایا ۔

ڈاکٹر راہی بی اے ایم ایس
ریڈینٹ کلینک مغل پورہ۔ حیدرآباد

۲۵ جنوری
۱۹۹۲ء

اقتباسِ تبصرہ

(بلٹز مورخہ ۲۵ راپریل ۱۹۹۲ئ)

استادی اور شاگردی کی روایت خاص طور پر اُردو شاعری کے لیے اگر ایک طرف شعراء کی انفرادیت کے لیے مُضر رہی ہے تو دوسری طرف اردو زبان اور خاص طور پر شعری زبان کے لیے محسن اعظم اور مسیحا رہی ہے. "انفرادیت" شاعری کے لیے کوئی ضروری وصف نہیں. ہاں شاعری کا ذوق و معیار کے مطابق اچھا ہونا ضروری ہے اور یہ ضرورت "استاد" پوری کرتے رہتے ہیں اس روایت کے کمزور پڑھنے سے اور کچھ خود ساختہ اہل نظر کی بوالہوسی کے سبب اردو کی ادبی زبان کا جو اثاثہ دُنیا کی نظر میں ادب اسالیب سے آنکھ ملانے کے قابل ہوگیا تھا اب غلط سلط تحریروں کا انبار بن گیا ہے.

حیدر آباد [دکن] میں اردو کی ترقی و ترویج کے لیے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں. صحت زبان، روزمرہ اور محاورے کا صحیح استعمال (خاص طور پر دکنی روزمرہ اور محاورے کا) عروض کے نکات اور زبان کی شستگی اور شائستگی کا جو خزانہ حضرت صفی اورنگ آبادی نے ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کئے بغیر زندگی بھر لٹایا، اس خزانے کے ورثا ان کے شاگردوں کا ایک بڑا معلومات آفرین تذکرہ ہے جسے محبوب علی خان اخگر نے مرتب کیا، محبوب علی خان اخگر اگرچہ صفی کے شاگرد نہیں ہیں لیکن ان کا بلاواسطہ تعلق حضرت صفی سے بڑا گہرا ہے. وہ صفی مرحوم کے عزیز ترین اور قابل ترین شاگرد غلام علی حاذی کے شاگرد ہیں اور غلام علی حاذی کے بارے میں خود صفی کہتے تھے کہ جو باتیں میرے ذہن میں مبہم ہوتی ہیں یا جو شبہ دل میں ہوتا ہے وہ میں حاذی سے دُور کرلیتا ہوں ...."

عزیز قیسی

(بمبئی)

اقتباسِ خط

۱۷ رجون ۱۹۹۱ء

مکرمّم بندہ ، و علیکم السلام آج صبح کی ڈاک میں تلامذہ صفی کا نسخہ، اخباروں کے تراشے، تصاویر، آپ کا اور برادرِ عزیز مُظفر مجاز کا کرمنامہ سب کے سب ایک ساتھ نازل ہوئے۔ کتاب کی صورت دیکھی، ورق گردانی کی۔ بہت دل خوش ہوا۔ [یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ حضرت حاوی مرحوم کے شاگرد ہیں۔ کیا کہنا۔ جناب حاوی صاحب سے مجھے نیاز حاصل تھا۔ مجھ پہ بڑی شفقت تھی۔ ان کے تعلق سے میرے احساسات ہمیشہ قدر و احترام میں ڈوبے ہوئے ہیں۔]

محمد ضیاء الدین احمد شکیب
[کرانٹ ہاؤز لندن]

اقتباسِ تبصرہ

[سیاست ۲۴ ستمبر ۱۹۹۱ء]

استاد صفی اورنگ آبادی [۱۸۹۳ء - ۱۹۵۴ء] دبستانِ دکن کے آخری بڑے شاعر تھے۔ صفی کے شاگردوں کی تعداد بڑی تھی، اس کا ٹھیک تعین کرنا اور یہ کہ ان کے شاگردوں نے ان سے کس قدر فیض اٹھایا مشکل ہے۔ کسی نے کم مدت میں زیادہ اور کسی نے زیادہ مدت میں کم اکتساب کیا۔ اس کا اندازہ تو ان کے شاگردوں کے کلام کے معیار و مزاج ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

تلامذۂ صفی کی چھان بین کی پیچیدہ مہم محبوب علی خان اخگر قادری نے اٹھائی۔ اخگر، صفی کے ایک تلمیذِ ارشد غلام علی حادی مرحوم کے شاگرد ہیں۔ حادی مرحوم سے مجھے نیاز حاصل تھا۔ فنِ سخن میں نہایت نکتہ رس اور دقیقہ سنج تھے۔ شعر کمالِ احتیاط سے کہتے تھے۔ استاد کی دقتِ نظر اور احتیاط اخگر کی شاعری میں کہاں تک آئی اس گفتگو کا یہ موقعہ نہیں۔ تاہم اخگر کی تلاش و تحقیق میں حادی کا حزم و احتیاط ضرور کارفرما ہے۔

اردو شاعروں کی دنیا رشک و رقابت سے بھری ہوتی ہے۔ اس راستے سے گزرنا آسان کام نہیں ہے۔ اخگر گو جلالی مزاج کے حامل ہیں لیکن قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے نہایت صبر و تحمل اور بردباری کے ساتھ یہ کام انجام دیا اور بہ وجوہِ احسن انجام دیا۔ شخصی کوشش اور ذاتی وسائل کے بل بوتے پر اس قدر وسیع سفینے کی تشکیل ایک نہایت دشوار کام تھا۔

دو سو چالیس (۲۴۰) صفحوں کے اس سفینے میں شروع کے ۴۴ صفحے تعارفی مضامین پر مشتمل ہیں۔ اور ۱۹۶ صفحات پر صفی اورنگ آبادی کے ایک سو ستاون شاگردوں کی فہرست اور ان کے منجملہ چھیاسی ۸۶ شاگردوں کا تذکرہ ہے۔ ابتداء میں ایک البم دیا گیا ہے جس میں چھیاسی کے منجملہ ترسٹھ تلامذۂ صفی کی تصویریں

شامل ہیں۔ ان تصویروں کا یکجا کر دینا بجائے خود ایک اہم کام ہے۔

تذکرے میں ہر شاگرد پر ایک علحدہ باب ہے جس میں پہلے سوانح عمری پھر حضرت صفی سے تلمذ کی تفصیلات اور آخر میں نمونۂ کلام دیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ حشو و زوائد سے پاک، سیدھا، حقائق پر مبنی اور ایک متوازن ناقدانہ نقطۂ نظر سے مرتب کیا گیا ہے۔

کتاب کی شروع میں سات مضامین تعارفی ہیں۔ جو پروفیسر اکبرالدین صدیقی پروفیسر رفیعہ سلطانہ، پروفیسر اشرف رفیع، مسٹر رؤف رحیم، مسٹر خواجہ معین الدین عزمی، مسز سید عبدالحفیظ محفوظ اور صفی اللہ کے علاوہ خود محبوب علیخان اخگر کے لکھے ہوئے ہیں۔ پروفیسر اشرف رفیع کا مضمون جامع ہے اور ایک اچھے نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے۔ اخگر کا سخن ہائے گفتنی اس تذکرے سے استفادے کے لیئے ایک ضروری مقدمے کی حیثیت رکھتا ہے۔

سرورق پر سعادت علیخان کا بنایا ہوا صفی کا اسکیچ نہایت کامیاب ہے۔ اور یہ سلام خوشنویس کے حسنِ قلم کے ساتھ بہت اچھا لگتا ہے۔

اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لیئے یہ ایک اہم اور خوبصورت تحفہ ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک قابلِ قدر علمی کام ہے مصنف ______ اس کتاب کی اشاعت کے لیئے قابلِ مبارکباد ہے۔

محمد ضیاء الدین احمد شکیب

[کرافٹ ہاؤز لندن]

○ حمد
○ نعت
○ منقبت

حمد

نظر سے پینے کی کچھ اور بات ہے ساقی
یہی شراب من الطیبات ہے ساقی

تو مسکرا کے جہاں دیکھتا ہے مے کش کو
وہ سکر غیرتِ صد مسکرات ہے ساقی

بہار ہو کہ خزاں بر سبیلِ کون و فساد
ہر ایک شارحِ نفی و ثبات ہے ساقی

عذاب ہے مری دانش تو کر عطا مجھ کو
وہ بے خودی جو دلیلِ نجات ہے ساقی

اسی قدر ہوں سفید و سیاہ سے واقف
ترے بغیر مجھے دن بھی رات ہے ساقی

ہوائے نفس کے بندے خدا کو بھول گئے
وہی پرستشِ لات و منات ہے ساقی

تمام رند ہیں اس وسعتِ کرم پہ نثار
برنگِ مے کدہ کل کائنات ہے ساقی

نہ رہنے پائے مرے سر میں نشۂ پندار
کہ تیری ذات کریم الصفات ہے ساقی

طلب مری، طلبِ التفات ہے ساقی
ہزار بات کی یہ ایک بات ہے ساقی

ہر ایک پھول ہے ساغر نما گلستاں میں
ہر اک کلی میں خمارِ حیات ہے ساقی

کسی کی بات میں یہ کیف یہ سرور کہاں
وہ تیرے ساتھ ہے جو تیری بات ہے ساقی

ملے وہ جام جو ہو امن و عافیت انجام
مری طرف نظرِ حادثات ہے ساقی

پئے حرارتِ دل چاہیئے وہ آتشِ تر
جو بہر زندگی آبِ حیات ہے ساقی

بقدرِ ظرف ہے ہر ایک رند کا وجدان
بقدرِ ذوق ہر اک واردات ہے ساقی

تو کائنات سے کرتا ہے بے نیاز جسے
اسی کے زیرِ قدم کائنات ہے ساقی

طواف ہے کدہ جائز ہے تیرے مستوں کو
یہ جرم داخلِ مستثنیات ہے ساقی

متاعِ کون و مکاں لے کے کیا کرے حادی
اسے عزیز فقط تیری ذات ہے ساقی

نعت

توجہ دل کی رکھ سوئے محمدؐ
یہ ہے آئینہ روئے محمدؐ

جبیں سائی کی دعوت دے رہا تھا
مجھے ہر ذرّہ کوئے محمدؐ

بدل جاتی ہے شانِ زندگانی
نظر آتا ہے جب روئے محمدؐ

رضا جو کیوں نہ ہو ساری خدائی
خدا خود ہے رضا جوئے محمدؐ

بہت باریک بیں سورج ہے لیکن
نہ دیکھا سایۂ موئے محمدؐ

وہ ہیں فِی ھٰذِہٖ الاَعمٰی کے مصداق
نظر جن کی نہیں سوئے محمدؐ

بنایا سیّد الکونین حق نے
دو عالم پر ہے قابوئے محمدؐ

تلاوت میں ہے نصِّ قابَ قوسین
تصور میں ہیں ابروئے محمدؐ

وہ جلوہ اور تابِ دید حاوی
سراپا نور ہے روئے محمدؐ

نعت

کوئی کیا جانے ہے کیا شانِ رسولِ عربی
سب سے ممکن نہیں عرفانِ رسولِ عربی

یہ سمجھتے ہیں غلامانِ رسولِ عربی
عرصۂ حشر ہے میدانِ رسولِ عربی

قبلۂ اہلِ یقیں نافِ زمیں بلد الامیں
مرکزِ دیں عربستانِ رسولِ عربی

ایسے الفاظ بتانے سے لُغت ہے قاصر
بہرِ مدحت جو ہوں شایانِ رسولِ عربی

کر دیا جس نے فصیحانِ عرب کو عاجز
ہے وہی معجزہ قرآنِ رسولِ عربی

کیا فلک اور ملک شمس و قمر جن و بشر
سب ہیں منت کشِ فیضانِ رسولِ عربی

حوصلہ دیکھتے ہیں ظرف پہ رہتی ہے نظر
سب پہ یکساں نہیں فیضانِ رسولِ عربی

بہرِ تادیب ہوا بے ادبوں کے حق میں
افتتاحِ ادبستانِ رسولِ عربی

نعت گوئی کا نہیں حوصلہ لیکن حاوی
بن گیا پیروِ حسانِ رسولِ عربی

نعت

ختمِ رُسل سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم
عقلِ اوّل نورِ مجسّم صلی اللہ علیہ وسلم

رب کے آقا سب کے مولیٰ رب سے برتر سب سے اولیٰ
سب سے مقدس سب سے مکرم صلی اللہ علیہ وسلم

جسمِ مطہر تھا بے سایہ کس نے پایا آپ کا پایہ
محبوبِ خلاقِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

شمعِ ہدایت ماحیٔ ظلمت رہبرِ ملت شافعِ امت
خلقِ خدا کے محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

کوئی نہیں جز ساقیٔ کوثر ایسا ہادی ایسا پیمبر
از آدم تا ابنِ مریم صلی اللہ علیہ وسلم

حق سے واصل خلق میں شامل انسانوں میں فردِ کامل
آپ مؤخر آپ مقدم صلی اللہ علیہ وسلم

نعتِ نبی کی ہے یہ محفل حادی تو بھی اس میں شامل
پڑھ اپنے ہر شعر میں پیہم صلی اللہ علیہ وسلم

نعت

تدبے سایہ لے کر آپ آئے
ہٹے سب ظلمتوں کے تھے جو سائے

برائے تشنگانِ علم و حکمت
سمندر علم و حکمت کے بہائے

اُخوت کی ملی تعلیم ایسی
وہ اپنے بن گئے جو تھے پرائے

جہاں تقویٰ ہو معیارِ بزرگی
وہاں فخرِ نسب کیا راس آئے

نبی تھے گرچہ قبل از خلقِ آدم
مگر ختمِ رُسُل آخر میں آئے

مقام لی مع اللہ اللہ اللہ!!
فرشتوں سے جہاں پہنچا نہ جائے

ادا کیوں کر ہو حقِ نعت حاوی
بڑی بات اور چھوٹا منہ سنائے!

نعت

ظہورِ جلوۂ بے صورتی خود عینِ صورت ہے
مرے سرکار کو دیکھو اگر چشمِ بصیرت ہے

جنھیں مطلوب سرکار دو عالم کی معیت ہے
طلب اُن کو نہیں جنت کی طالب اُنکی جنت ہے

کہاں کی حق رسی جُز اتّباعِ سرورِ عالم
حقیقت میں شریعت زینۂ بامِ طریقت ہے

عمل سے اپنے دنیا کو دکھا دو برتری اپنی
تمہارے حق میں جب ارشادِ کُنتُم خَیرَ اُمَّت ہے

بڑا ہے بے طلب دینِ نبی تو شکر بھی کیجئے
مگر ملت سے ایسی سرکشی کُفرانِ نعمت ہے

بڑے درجے صحابہ کو ملے فیضانِ صحبت سے
مقدم سب پہ بعد انبیا اُن کی فضیلت ہے

رسول اللہ کے خدام ہی مخدومِ عالم ہیں
خدا کے آگے جُھک جاؤ اِسی پستی میں رفعت ہے

دلیلِ عظمتِ نامِ نبی ہے کلمۂ طیّب
جو الا اللہ کے ہمراہ بے عطف و اضافت ہے

زیارت سے مُشرّف ہونے والوں میں ہے نام اس کا
یہ ادنیٰ امتی حاوی بھی حق دار شفاعت ہے

نعت شریف

حدیث الفاظ سے دل قرآن پیغام ربانی ہے
ہر اک ارشاد آنحضرت کا وحیٔ آسمانی ہے

بقا کیا ہے فنا کیا بحثِ الفاظ و معانی ہے
جو باقی ہے وہ باقی ہے جو فانی ہے وہ فانی ہے

جو سچی پیروی کرتے ہیں سرکارِ دو عالم کی
حیاتِ طیبہ دنیا میں ان کی زندگانی ہے

غلامی کا شرف حاصل ہے مجھ کو ایسے آقا کا
نہ جن کا کوئی ہمسر ہے نہ جن کا کوئی ثانی ہے

کبھی مہرِ فلک نے سایۂ قامت نہیں دیکھا
مجسم نور ہونے کی یہی روشن نشانی ہے

مشرف ہو جو رویا میں تو رات اسکی برات اسکی
نصیب اس کا جو مصداقِ حدیثِ من رآنی ہے

میں دل دادہ ہوں رنگِ رومیؔ و عطارؔ کا حادیؔ
نہ یہ طرزِ نظیریؔ ہے نہ اسلوبِ فغانیؔ ہے

نعت

کل کی نہ سوچ کر لے عمل استوار آج
حاصل ہے تجھ کو زندگی مستعار آج

سرکار کا مہینہ ہے محفل ہے نعت کی
شرکت کا حاضرین کو ہو افتخار آج

صوفی صفی کے عرس نے بخشا ہے یہ شرف
مصروفِ نعت گوئی ہے یہ خاکسار آج

ہر ایک آبدیدہ ہے بارش کے واسطے
اہلِ دکن کے دل ہیں بہت بے قرار آج

اے سرورِ دو عالم و سردارِ انبیاء
معروضہ آپ سے ہے بہ صد انکسار آج

سب کی نظر ہے آپ پہ آقائے نامدار
سُن لیجیے غلاموں کی اپنے پکار آج

ہو آپ کی نگاہِ کرم تو یقین ہے
آجائے ہم پہ رحمتِ باری کو پیار آج

آتا ہے لب پہ نامِ مبارک حضور کا
وردِ زباں درود بھی ہو بار بار آج

حادی رہے کلام میں آداب کا لحاظ
ہے نعت و منقبت پہ سخن کا مدار آج

عیدِ میلاد

ہے یہ وہ عیدِ مجلسِ میلاد
جس کی تھی سال بھر سے ہم کو یاد

یوں تو ہر ایک عید ہوتی ہے
انبساط و سرور کی بُنیاد

مگر اس عید کی سی شان کہاں
جس کا احسان جتائے ربِ عباد

ق

یہ وہی عید ہے مسلمانو
سن کے خوش خبری جس کی ہو کر شاد

بولہب جیسے سخت کافر نے
اپنی لونڈی کو کر دیا آزاد

کیوں نہ پھر ہم خوشی منائیں گے
حسبِ مقدور حسبِ استعداد

عیدِ میلادِ سید الکونین
ہے حقیقت میں سید الاعیاد

یہ وہ مولود ہیں کہ جن کا وجود
دو جہاں کا ہے باعثِ ایجاد

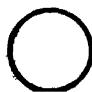
عید ہر جا منائی جاتی ہے
مجلسوں کی نہیں کوئی تعداد

جس کو دیکھو خوشی سے مالا مال
جس کو دیکھو نہال و خرم و شاد

سرخوشِ بادۂ نشاط ہیں سب
بندِ غم سے ہر ایک ہے آزاد

آج ہر گھر میں ہے خوشی کی دھوم
آج ہر جا ہے مجلسِ میلاد

میں بھی دیتا ہوں اس لیے حاؔدی
عیدِ میلاد کی مبارکباد



منقبت

صورتِ صدیق میں تھا جلوۂ روئے رسول
سیرتِ صدیق تھی آئینۂ خوئے رسول

حاملِ شانِ رسالت تھی خلافت آپ کی
آپ کے ہاتھوں نے پایا زورِ بازوئے رسول

پیروی سنت کی تھی ہر حال میں پیشِ نظر
تھیں لگاہیں آپ کی ہر امر میں سوئے رسول

سب تصدق کر دیا سرکار پر مال و منال
کون تھا ایسا سخی دعاشقِ روئے رسول

آپ کی دختر بھی علم و فضل میں تھیں آفتاب
یعنی حضرت عائشہ بانوئے مشکوئے رسول

زندگی میں تھے رفاقت کی بدولت یارِ غار
بعدِ رحلت استراحت کر رہے پہلوئے رسول

سب سے پہلے آپ کے انفاسِ بابرکات سے
انفس و آفاق نے پائی ہے خوشبوئے رسول

منقبت

صحابہؓ کے دلوں میں تھی محبت میرے مولا کی
دل و جاں سے سبھی کرتے تھے عزت میرے مولاؑ کی

جسے کہتے ہیں باب علم وہ ذاتِ گرامی ہے
مُسلّم کیوں نہ ہو علمی فضیلت میرے مولا کی

تلافی کے عوض دیدی معافی اپنے قاتل کو
پھر اُس پر رحم کرنے کی وصیت میرے مولا کی

لِلّٰہ مغلوب دشمن کو رہائی تھوک دینے پر
یہ تھی للّٰہیت شانِ فتوت میرے مولا کی

نظیر ایسی کسی تاریخ عالم میں نہیں ملتی
رہی غزوات میں جیسی شجاعت میرے مولاؑ کی

سلاسل منتہی ہوتے ہیں سارے ذاتِ والا پر
سمجھ لیجے اسی کثرت میں وحدت میرے مولا کی

غلامی کا تعلق نام سے ظاہر ہے اے حاوی
خُدا کا فضل ہے مجھ پر عنایت میرے مولا کی

منقبت

در معرفتِ حق کا ہے کاشانہ علی کا
مخزن مئے وحدت کا ہے مئے خانہ علی کا

پا سکتی نہیں عقل کبھی اس کی حدوں کو
کس رتبے کا دیوانہ ہے دیوانہ علی کا

قرآں کی تفسیر احادیث کی تعبیر
ہوتا ہے ہر اک قولِ حکیمانہ علی کا

اللہ کا یہ شیر ہزاروں پہ تھا بھاری
تھا پیکِ اجل نعرۂ شیرانہ علی کا

قاتل سے بھی اپنے نہ لیا آپ نے بدلا
اللہ غنی خلقِ کریمانہ علی کا

فرمانِ نبی لحمک لحمی سے ہے ظاہر
یہ پایہ کسی اور نے پایا نہ علی کا

ہے رشک فرشتوں کو ترے بخت پہ حاوی
رکھتا ہے جو تو مشربِ رندانہ علی کا

کچھ نہیں رکھتا بجز شوقِ لقائے بوترابؓ
دونوں عالم سے ہے مستغنی گدائے بوترابؓ

صاحبِ عرفاں ہیں سب دل سے فدائے بوترابؓ
سرمۂ اہلِ نظر ہے خاکِ پائے بوترابؓ

اُن سے راضی ہیں رسول اللہ بھی اللہ بھی
جس کو حاصل ہو گئی پہلے رضائے بوترابؓ

منزلِ مقصود پر سالک پہنچ سکتا نہیں
راہ بر جب تک نہ ہو گا نقشِ پائے بوترابؓ

آستاں پر اُس کے جھکتے ہیں شہنشاہوں کے سر
کون پا سکتا ہے؟ یہ شانِ گدائے بوترابؓ

حسبِ استعداد ہے فیضان سب پر آپ کا
علم کا سرچشمہ ہے دولت سرائے بوترابؓ

وقتِ مشکل کیوں نہ ہو نامِ علیؓ مشکل کشا
اللہ اللہ ہے یہی نامِ خدائے بوترابؓ

کوئی عارف یہ مقام و مرتبہ پائے کہاں
ہے ہر اک کی انتہا سے ابتدائے بوترابؓ

آپ کی تعریف کی ہے خود رسول اللہؐ نے
میں کہاں حادی؟ کہاں مدح و ثنائے بوترابؓ؟

منقبت

کرم مجھ پر ہو اب ایسا امامِ جعفرِ صادق
پلٹ جائے مری کایا امامِ جعفرِ صادق

کہیں مغموم رہتا ہے کہیں محروم رہتا ہے
سوالی آپ کے در کا امامِ جعفرِ صادق

مجھے بھی کچھ میسّر ہو، عطا ہوتا ہے جب سب کو
تصدق اپنے نانا کا امامِ جعفرِ صادق

میں سائل ہوں میں سائل ہوں غلاموں میں بھی شامل ہوں
سخی داتا! سخی داتا! امامِ جعفرِ صادق

مجھے بھی منقبت گوئی کی عزت ہو گئی حاصل
نہ تھا گو حوصلہ اتنا امامِ جعفرِ صادق

صداقت بھی تصدق آپ کی ذاتِ گرامی پر
پھر اس پر نام بھی سچا امامِ جعفرِ صادق

یہ حادی آپ کا خادم عمل سے اپنے ہے نادم
مدد فرمائیے آقا امامِ جعفرِ صادق

منقبت

بڑے پیر کی جو تفاسیر ہیں
حقائق معارف کی تفسیر ہیں

وہی پیرِ پیراں وہی محیٔ دیں
جو سب سے کرامات ہیں میر ہیں

ولی ہو کہ عارف قطب ہو کہ غوث
ہر اک پیر ہے۔ یہ بڑے پیر ہیں

وہ ہیں معترف ان کے فیضان کے
طریقت میں جتنے مشاہیر ہیں

بڑا ہے تصرف، بڑے پیر کا
مکاں لامکاں زیرِ تسخیر ہیں

ولایت سے جتنے ہوئے سرفراز
وہ سب آپ ہی کے قدم گیر ہیں

یہی بن گیا اِن کا اسمِ عَلم
"بڑے پیر بے شک بڑے پیر ہیں"

مگس جسمِ اطہر پہ کیوں بیٹھتی
یہ جب اپنے نانا کی تصویر ہیں

غلامِ شہنشاہِ بغداد ہوں
مرے پیر حاوی بڑے پیر ہیں

منقبت

ننگِ نام و نشاں سراپا ہوں
چشمِ عبرت ترا تماشا ہوں

اور نام و نمود کیا چاہوں؟
غوثِ اعظم کا نام لیوا ہوں

ہوں غلامِ شہنشہِ بغداد
رشکِ قیصر ہوں فخرِ کسریٰ ہوں

ہے بڑے پیر سے مری نسبت
ایک قطرہ بھی ہوں تو دریا ہوں

میری ہستی ہے عالمِ اصغر
میں بھی دنیا میں ایک دنیا ہوں

آستاں بوس ہوں تصور میں
میری جلتی پہنچ بھی پہنچا ہوں

کبھی میری بھی یاد ہو جائے
پیکرِ حسرت و تمنا ہوں

مدحِ غوث الوریٰ زباں میری؟
ایسی منزل پہ ٹھیر سکتا ہوں؟

ہے بڑی بات منقبت حاوی
منہ جو چھوٹا ہے منہ کی کھاتا ہوں

منقبت

وقتِ آلام ست جانِ ناتواں یا غوثِ پاک
الاماں والاماں والاماں یا غوثِ پاک

ذاتِ تو ابرِ سخا بحرِ کرم عمانِ جود
فیض بخشِ کائناتِ انس و جاں یا غوثِ پاک

ہست ارشادِ مریدی لاتخف در گوشِ من
فارغم ز اندیشۂ ہر دو جہاں یا غوثِ پاک

تو شہنشاہِ جہان و قطب الاقطابِ زماں
حکمِ تو جاری ست در کون و مکاں یا غوثِ پاک

پیشوائے واصلاں اے مقتدائے سالکاں
بہرہ ور ہستند از تو عارفاں یا غوثِ پاک

من باین نازم کہ ہستم در سگانِ کوئے تو
جان و دل بادا نثارِ آستاں یا غوثِ پاک

یک نظر کافی ست بہ سوئے حاوی خستہ جگر
چشم ہا دارد ز لطفِ بیکراں یا غوثِ پاک

منقبت

شان درویشوں کی ملبوس فقیرانہ ترا
رعب اور دبدبہ لیکن ہے امیرانہ ترا

بادۂ عشق سے لبریز ہے پیمانہ ترا
سب سے بیگانہ بنا دیتا ہے میخانہ ترا

کچھ عجب شان کا میخانہ ہے میخانہ ترا
عبد کو رب سے ملا دیتا ہے پیمانہ ترا

چُپ نہیں یوں ترے دربار میں خلقت کا ہجوم
چشمۂ دولتِ دارین ہے کاشانہ ترا

تو شفا بخش ہے دُکھ درد کے بیماروں کا
شہرا جمیر ہے مشہور شفاخانہ ترا

اے شہِ ہند حکومت ہے دلوں پر تیری
اب بھی جاری ہے ہر اک حکمِ ملوکانہ ترا

ظُلمتِ شرک ترے قدموں سے کافور ہوئی
بانگِ توحید بنا نعرۂ مستانہ ترا

مومن و کافر و مشرک کی کوئی قید نہیں
جس کو دیکھو نظر آتا ہے وہ دیوانہ ترا

پاک باطن ہیں ترے رند فرشتوں کی طرح
کیوں نہ ممدوحِ ملائک رہے میخانہ ترا

اس کے قدموں پہ تصدق ہے ہر اک دانائی
سارے فرزانوں کا سرتاج ہے دیوانہ ترا

تو وہ ہے شمعِ ولایت کہ ضیا سے تیری
رشکِ خورشید ہر اک بن گیا پروانہ ترا

آج تک تیرا تصرّف ہے وہی بعدِ وصال
آج تک بھی وہی فیضان ہے روزانہ ترا

جبہہ سائی سے سلاطین کی خود ظاہر ہے
کسوتِ فقر میں جو ٹھاٹ ہے شاہانہ ترا

بن گیا شمعِ ہدایت وہ خلائق کے لیے
واہ کس شان کا پروانہ ہے پروانہ ترا

تیرا ہر رند ہے دنیا میں طریقت کا امام
اللہ اللہ وہ ہے مشربِ رندانہ ترا

آستاں بوسی کی ہم کو بھی سعادت ہے نصیب
عرس ہوتا ہے بڑی دھوم سے سالانہ ترا

تیری تعریف سے قاصر ہے زباں حاوی کی
خود ہی کشافِ حقیقت ہے ہر افسانہ ترا

منقبت

فقیری میں رہی قرباں روائی میرے خواجہ کی
بہ شانِ بندگی دیکھو خدائی میرے خواجہ کی

خدانا آشنا بھی آشنائے حق نظر آئے
ہوئی ہے جب میسر آشنائی میرے خواجہ کی

خدا جانے کہاں تک ہے سمجھ میں آ نہیں سکتی
رسائی اور پھر کس کی رسائی میرے خواجہ کی

حصولِ قربِ حق میں کوئی دشواری نہیں ہوتی
تعالی اللہ شانِ رہ نمائی میرے خواجہ کی

لوید عِندَ ذِکرِ الصّالحِین تنزلُ الرحمہ
بنی ہے باعثِ مدحت سرائی میرے خواجہ کی

یہ جب لونر نظر لخت جگر مشکل کشا کے ہیں
نہ ہو مشکل میں کیوں مشکل کشائی میرے خواجہ کی

یہاں کا مبتدی بھی منتہی سے کم نہیں ہوتا
یہ ہے کیسی نوازش انتہائی میرے خواجہ کی

غلاموں پر ہمیشہ رہتی ہے چشم کرم حادی
نہیں رکتی کبھی حاجت روائی میرے خواجہ کی

غـزلیـات

ردیف (الف)

اگر افسانۂ وحشت رہے محتاج عنواں کا
دکھا دوں گا زیادہ کر کے چاک اپنے گریباں کا

ہر اک گوشہ الجھتا ہی رہا صحرا کے داماں کا
کہاں جنگل میں منگل، قیس کا ناٹا تھا بیاباں کا

خیال اوروں کا ان کے سامنے آتا ہے تو آئے
لحاظ و پاس بھی لازم ہے کیا ناخواندہ مہماں کا

جہاں اے وحشتِ دل تو بہار اپنی دکھاتی ہے
بدلتا ہے بیاباں سے وہاں منظر گلستاں کا

نہیں دنیا میں کوئی بیکسوں کا پوچھنے والا
ہوا عریاں جو مجنوں دامنِ صحرا نے کب ڈھانکا

نہ آئے تم خیال آتا رہا کیوں رات بھر مجھ کو ؟
تمہارے قول کا، اقرار کا، وعدے کا، پیماں کا

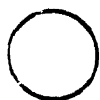
پس بربادیٔ گلشن بہار اس رنگ سے آئی
کلی کی شکل پہ دھوکا ہوا خارِ بیاباں کا

مدد اے ضبطِ غم! قطرہ بھی کیا عینِ سمندر ہے؟
جو پی سکتے نہیں آنسو ہم اپنی چشمِ گریاں کا

مجھے دیکھا ہے جب ترچھی نظر سے اس نے دیکھا ہے
لگا ہوں پر اثر پڑتا ہے کیا برگشتہ مژگاں کا

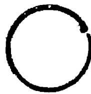
نہ کر اندازۂ کردار میرے چاکِ داماں سے
گواہِ عصمتِ یوسفؑ بنا چاک اُن کے داماں کا

بھلا جمعیتِ خاطر کا طالب کیوں رہے حاوی
یہ ٹھہرا دیکھنے والا تری زلفِ پریشاں کا



رُباعی

تاروں کو فلک سے توڑ لائے کوئی
یا چاند میں گھر اپنا بسائے کوئی
دُنیا کو مبارک یہ ترقی ہو مگر
انسان کو انسان بنائے کوئی



نہ ہو اظہار کیوں دردِ نہاں کا
نظر خود کام کرتی ہے زباں کا

مجھے سجدے کی دعوت دے رہا ہے
ہر اک ذرہ کسی کے آستاں کا

ہے باہم ربطِ حُسن و عشق ایسا
تعلق جیسے باہم جسم و جاں کا

اُسے حدِّ نظر اب کہہ رہے ہیں
بھرم بھاری تھا پہلے آسماں کا

یہ کیسی وسعتِ دِل اللہ اللہ
مکاں پر حُسن ظن ہے لامکاں کا

کھٹکتا تھا نظر میں بجلیوں کی
ہر اک تنکا ہمارے آشیاں کا

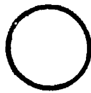
یہ بے ربط آپ بیتی کیا سُناؤں
کوئی عنوان نہیں اس داستاں کا

زمانے پر تسلط عشق کا ہے
یہ عنوانِ سخن ہے ہر زباں کا

یہ "دُنیا رہ گزر ہے" مانتا ہوں
مگر ہے راستہ آخر کہاں کا

سکونِ زندگی کیا خاک پائیں
قدم رُکتا نہیں عمرِ رواں کا

نہیں رکھتا سخن میں ضُعفِ تالیف
عمل حاوی تری فکرِ جواں کا



رُباعی

اسرار و معارف کا خزینہ ہے کلام
پاکیزہ مضامین ہیں گویا الہام
امجد کی میں تعریف کروں کیا حاوی
دُنیا سے اُٹھ گیا دکن کا خیام

نہ پوچھو رنگ پھر حُسنِ بیاں کا
وہ جب پہلو بدلتے ہیں زباں کا

یہ عشق و حُسن کی نسبت کھول کیا
تفاوت ہے زمین و آسماں کا

چمن کی وہ فضا لائے کہاں سے
قفس بن کر نمونہ آشیاں کا

اُٹھایا بزم سے جس سنگ دل نے
بنا ہوں پتھر اُس کے آستاں کا

روا جا ہے بجا سمجھو کہ بے جا
زمیں والوں کو شکوہ آسماں کا

چمن پر آنچ تک آنے نہ پائی
یہ تھا ایثار میرے آشیاں کا

حجاب آتا ہے اُن کو گفتگو سے
یہی پردہ ہے گویا درمیاں کا

اثر میں ڈوب کر ہر لفظ نکلے
اگر دل سے تعلق ہو زباں کا

مزہ پھر کیوں نہ دے ہر شعر حاوی
غزل میں ہو جو چٹخارہ زباں کا



کیا علم ہو کسی کو میرے غمِ دلی کا
ہونٹوں پہ مسکراہٹ دھوکہ بھی ہے خوشی کا

مانا کہ بندگی ہی مقصد ہے زندگی کا
کس سے ادا ہوا ہے حق تیری بندگی کا

دل آپ پر جو آیا۔ ٹھہرا قصور میرا
الزام ہے کسی پر۔ اقدام ہے کسی کا

مکتب میں عشق کے ہیں کیا سارے ہم جماعت
جو حال مبتدی کا وہ حال منتہی کا

اپنا سمجھ کے تم کو اترا رہے ہیں ہم تو
تم ہم سے کہہ رہے ہو کوئی نہیں کسی کا

مرنے کے بعد ان کا رہتا ہے نام زندہ
لیتے ہیں زندگی سے جو کام زندگی کا

جب سے رفیق ہستی ٹھیری سیاہ بختی
ظلمت سے لے رہا ہوں میں کام روشنی کا

اُس نے ضمیر ہی کو مُردہ بنا دیا ہے
جینا اگر ہے بدلو ماحول زندگی کا

آنکھوں کی روشنی کو ہم روشنی سمجھتے
کرتی اگر ازالہ یہ دل کی تیرگی کا

احساسِ زندگی میں ہے تلخیٔ اجل بھی
ہم پایہ موت کا ہے ہر موڑ زندگی کا

حاویؔ یہ شکوہ سنجی اُس کی ہے ناسپاسی
جس کے ستم نے بخشا ہے ذوق شاعری کا



رُباعی

دُنیا نہیں کیوں صاحبِ قوت کی حریف؟
کیوں مشقِ ستم رہتے ہیں کمزور و نحیف
پیدا جو ہوا اِس کے تعلق سے سوال
حاویؔ نے کہا "نزلہ براعضائے ضعیف"

ہے نظمِ کائنات کچھ اس اعتدال کا
ملتا نہیں کہیں کوئی پہلو سوال کا

کیوں مضحکہ اُڑاتے ہیں لوگ اہلِ فال کا
آئینہ دار فال ہی ہوتا ہے حال کا

ہر اعتبار دین کا ہے طالبِ یقیں
کیا اعتبار وہم و گمان و خیال کا

نعمت میں شکرِ حق جو ادا ہو نہیں سکا
قائل ہوں "قدرِ نعمت بعدِ زوال" کا

کرتے تھے سابقین مباحات سے گریز
ہم میں نہیں ہے فرق حرام و حلال کا

تخلیقِ نار ہی میں ودیعت ہے سرکشی
سجدے کا حکم حیلہ تھا اک اشتعال کا

پالا اگر پڑے گا برہمن کو شیخ سے
معلوم ہوگا بھاؤ اُسے آٹے دال کا

احکام آپ کے نہیں ناممکن العمل
اس پہ بھی حق ادا نہ ہوا امتثال کا

فرصت سے سوچ لیں یہ ذرا تارکِ صلوٰۃ
کیا ہے جواب حشر میں پہلے سوال کا

کیا حال میں بیان کروں اہلِ حال کا
ان کا کوئی مقام نہیں قیل و قال کا

رکھتے ہیں اعتماد جو ظنی علوم پہ
کرتے ہیں اعتبار شگون اور فال کا

لاتے ہیں کوڑی حضرتِ واعظ جو دُور کی
کیا کوڑیوں کے مول ہے عالم مثال کا

ہر ذرہ ذرہ اپنی جگہ آفتاب ہے
کیا پوچھنا حضور کے بذل و نوال کا

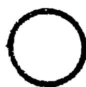
رکھتا نہیں جہت کوئی عقبیٰ کا راستہ
یہ شرق و غرب کا نہ جنوب و شمال کا

اپنی خطا کا آپ مجسّم گواہ ہوں
چہرہ کھلا ثبوت ہے خود انفعال کا

مرنے کو اپنے عید سمجھتے ہیں اہلِ قرب
یعنی ہے موت نام خدا سے وصال کا

جب نفیٔ مثلِ مثل ہے لیس کمثلہٖ
کس منہ سے نام لے کوئی اُن کی مثال کا

حادی نہیں ہے بخششِ حق میں کوئی کمی
پھیلاؤ دیکھتا ہوں میں دستِ سوال کا



اب ہم سے کیا علاج ہو اس اشتباہ کا
ٹھہرا دیا ہے نام بُرا تم نے چاہ کا

احسان آج مانئے اپنی نگاہ کا
اب کل کے روز منہ نہ رہا دادخواہ کا

دل نے طریقِ عشق میں گم کر دیا مجھے
اب کون راہبر بنے گم گشتہ راہ کا

اوقات ہو رہی ہے فرشتوں کی بھی خراب
لکھتے ہیں یہ حساب ہمارے گناہ کا

جب تیری آنکھ میں ہی مروت نہیں رہی
پھر کیا قصور کوئی بتائے نگاہ کا

فرقت کی شب ہزار بلاؤں سے کم نہیں
اللہ منہ دکھائے نہ اس روسیاہ کا

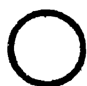
حیرت کی بات کیا ہے اگر وہ اثر نہ لیں
اُن پر تو کوئی جبر نہیں اپنی آہ کا

اے شیخ آ گئے ہو تو چپ چاپ بھی رہو
اب میکدے میں ذکر ہی کیا خانقاہ کا

یوسف کنوئیں میں گر کے اٹھائے جو رنج و غم
اس میں قصور کیا تھا زلیخا کی چاہ کا

اب تو ہر ایک اپنا پرایا ہے باریاب
دستور کچھ عجب ہے تری بارگاہ کا

کیوں چاہتے وہ اپنی جفاؤں سے معذرت
ہے عذر تو گناہ سے بدتر گناہ کا



رباعی

سر سے کیوں جائے کسی کا سودا
گڑ سے میٹھا ہے خوشی کا سودا
ایک تو ہی نہیں دل کا گاہک
تیری الفت بھی ہے جی کا سودا

کیوں غیر پر اثر ہو بُرا اُس کی چاہ کا
میرا ہی چاہنا ہے مترادف گناہ کا

چکر میں ہیں جنابِ خضر بھی تو اس جگہ
کھلتا نہیں ہے پیچ محبت کی راہ کا

ہم ٹال بھی سکے نہ ذرا دل کی بات کو
فرمان ماننا ہی پڑا بادشاہ کا

دیکھا ہے اس کو حضرتِ زاہد نے پیار سے
کیسے سے ارتکاب ہوا ہے گناہ کا

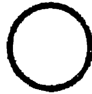
تیرے نہ دیکھنے کی شکایت نہیں مجھے
لیکن بڑا غضب ہے چُرانا نگاہ کا

کیا کہہ سکے وہ داورِ محشر کے روبرو
منہ دیکھتے رہو گے جو تم داد خواہ کا

وہ دور سے دکھائی دیا ناصحِ شفیق
دھوکہ ہو کاش یہ بھی ہماری نگاہ کا

پامال کر رہا ہے کسی کا خرام ناز
طرفہ ستم پھر اُس پہ ہے نیچی نگاہ کا

حادی یہ رات دن ہے تصور بندھا ہوا
کس رشکِ آفتاب کا کس رشکِ ماہ کا



پھر مزہ دیتی ہے اُن کی شوخیٔ تقریر کیا
وہ کہیں تقصیر کی، پوچھوں میں "جی! تقصیر کیا؟"

حضرتِ ناصح ذرا عاشق تو بن کے دیکھئے
عشق کی تاثیر کیا ہے حُسن کی تسخیر کیا

جو جگہ جس کو ملی، جیسی ملی، اچھی ملی
تیری محفل میں کسی کی عزّت و توقیر کیا

پھر گیا آنکھوں میں نقشہ اُسکی بزمِ ناز کا
اے تصور واہ تو نے کھینچ دی تصویر کیا

چل پڑے سن کر اذاں وہ اور کوئی چل بسا
صورِ اسرافیل تھا یہ نعرۂ تکبیر کیا

آنکھوں آنکھوں میں کسی نے حال اپنا کہدیا
تم نے سمجھی بھی مگر یہ بے صدا تقریر کیا

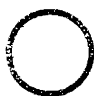
کوئی کس انداز سے پہلو نشیں تھا خواب میں
جب کھلیں میری آنکھ اُٹھی ہوگئی تعبیر کیا

اس کا رونا ہے کہ اُسکی آنکھ ہم سے پھر گئی
انقلابِ دہر کیا ہے گردشِ تقدیر کیا

عشق کی سرکار کر دیتی ہے سب سے بے نیاز
عزّت و توقیر کیا ہے ذلت و تحقیر کیا

خط میں بھی جانے نہ پائی روزمرہ بول چال
میں تصدق ہے تیری تحریر میں تقریر کیا

ہے کوئی زہرہ جبیں جلّاد تیری آڑ میں
ورنہ تیرا اٹھا ہی اے آسمانِ پیر کیا



رُباعی

بے قید جوانوں کا چلن ہے آزاد
کیا شعر و سخن طرحِ سخن ہے آزاد
شعر اپنی جگہ کیوں رہے پابندِ عروض
آزاد ہے شاعری تو فن ہے آزاد

کوئی ہو آہِ سحر کیا نالۂ شبگیر کیا
جو ترے دل میں ترازو ہی نہ ہو وہ تیر کیا

ختم ہو اک بات تو پھر دوسری فرمائیے
داستانِ درد داستانِ زنجیر در زنجیر کیا

چشمِ خواب آلود اُن کی یوں بھی فتنہ تھی مگر
ہے یہ سونے پہ سہاگہ سُرمئی تحریر کیا

مجھ کو تڑپا کر اُدھر وہ خود تڑپنے لگ گئے
اب کوئی دیکھے کہ ہے صیاد کیا نخچیر کیا

یہ دکھا دیتی ہے رنگا رنگ جلوے رات دن
کام کرتی ہے مصوّر کا تیری تصویر کیا

یوں خیالِ یار آئے اور بے تعظیم جائے
تو نے اے دردِ جگر اُٹھنے میں کی تاخیر کیا

چھوٹ سکتے ہی نہیں مضمونِ زلفِ یار سے
شاعروں کو کرتی ہے پابند یہ زنجیر کیا

صید نکلا چاہتا ہے زد سے اے ناوک فگن
شوق میں اک تیر کیا دو تیر کیا سو تیر کیا

اور ہے مشقِ سخن شیریں زبانی اور ہے
شاعری حادی حقیقت میں ہے ٹیڑھی کھیر کیا

نظامِ گردشِ شمس و قمر کیا
فریبِ شام و نیرنگِ سحر کیا

یہ زُہدِ خشک یہ دامانِ تر کیا
طلسمِ کائناتِ بحر و بر کیا

مناظر ہیں یہ اب پیشِ نظر کیا
نئی تہذیب ہے زیر و زبر کیا

جہاں ملحوظ ہو صورت پرستی
وہاں جانے کوئی ذوقِ نظر کیا

نہیں ہوتی مکرر ہر تجلی
کوئی پہچانے اُن کو دیکھ کر کیا

محبت دل میں ہے کتنی زیادہ
عبارت ہے زباں پر مختصر کیا

رہے میرا جنوں مجھ کو مبارک
کریں گے لوگ آخر پوچھ کر کیا

رہے جس کی نظر قیدِ جہت میں
وہی دیکھے اِدھر کیا ہے اُدھر کیا ؟

زباں سے آہ بھی نکلی ادھوری
ابھی رودادِ غم ہو مختصر کیا

خوفِ گنہ نہ شوقِ حصولِ ثواب کا
اللہ رے خود فریب زمانہ شباب کا

عارض ہے یوں نگاہ میں اُس محوِ خواب کا
دھوکہ ہو جیسے رات کے وقت آفتاب کا

مہمل قرار دیتے ہیں میرے سوال کو
جب سوجھتا نہیں کوئی پہلو جواب کا

دنیا میں تم اُبھر کے نہ اِتراؤ اس قدر
دیکھو ذرا قیام ہے کتنا حباب کا

اصلی قصوروار نہیں زد میں آپ کی
میں بے خطا بنا ہوں نشانہ عتاب کا

غمزہ ہو، یا خرام، تبسم ہو، یا کلام
ہر شیوہ لاجواب ہے اس لاجواب کا!

اُس کی نشیلی آنکھ کو تکتا ہوں اسلیے
[illegible] منھ سے نہ اس شراب کا

اس کے خیال کا ہے تسلط دماغ پر
بیدار ہوں ضرور مگر شک ہے خواب کا

لیتے ہیں یوں تو درسِ محبت ہزار ہا
لیکن کسی کو علم نہیں ہے نصاب کا

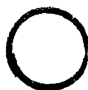
ثابت قدم جو رہتے ہیں اپنے اصول پر
وہ لوگ پھیر دیتے ہیں منہ انقلاب کا

حادی وہاں سکون کی اُمید کیا رکھوں
ہے زندگی ہی نام جہاں اضطراب کا



رُباعی

تحقیق کی کب فکر و نظر عادی ہے
تقلید میں بے فکری ہے آزادی ہے
کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْن
جن کا جو وتیرہ ہے وہ بنیادی ہے

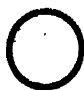


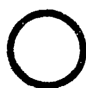
اثر پھر دیکھ لیتے شیخ جی اپنی نصیحت کا
اگر قسمت سے ملتا کوئی ان کو اچھی صورت کا

عجب یہ پرہیزگاری ہے کہ حوروں سے محبت ہے
جناب شیخ کیا کہنا تمہاری آدمیت کا

کبھی تولہ کبھی ماسہ گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ
کوئی کیا خاک اندازہ کرے انکی طبیعت کا

کہیں دشمن سبق تم سے نہ لے تم نے تو اے حادی
کتاب حسن کو باندھا ہے شیرازہ محبت کا





مجھ کو سمجھانے کی جو بات ہو ایسا سمجھا
منہ سے نکلے مرے بے ساختہ سمجھا سمجھا

خود کو عاشق تجھے معشوق جدا اپنا سمجھا
حق تو یہ ہے کہ سمجھنے کا جو حق تھا سمجھا

حضرتِ شیخ کے ارشاد پہ کیا حرف رکھوں
بات پلے نہ پڑی سن کا تقاضا سمجھا

کس مپرسی کسے کہتے ہیں اُسی سے پوچھو
اُن کی محفل میں بھی اپنے کو جو تنہا سمجھا

بات اَدھوری رہی شرما گئے تم کہہ نہ سکے
یہ جدا بات ہے میں اس کو جو پورا سمجھا

تیری صورت پہ فدا اور صدا پہ ہوں نثار
حسنِ یوسفؑ اُسے اس کو دمِ عیسیٰ سمجھا

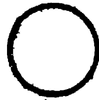
ان کو چھو بھی نہ سکا دامنِ یوسفؑ کی قسم
ہائے یہ ہاتھ جسے دستِ زلیخا سمجھا

دمِ نظارہ تکلّم کی نہ تھی مجھ میں سکت
آپ نے دیکھ کے گم صم مجھے گونگا سمجھا

میرے دل میں رہی پوشیدہ اُسی کی اُلفت
دیکھ کر جو مرے ظاہر کو الفت سمجھا

آپ کی پردہ نشینی تھی سمجھ سے باہر
اپنی ہستی ہی کو میں آپ کا پردا سمجھا

اک معمّہ ہے یہ عرفانِ خودی اے حاوی
کچھ سمجھ ہی نہ سکا اپنے کو جتنا سمجھا



رُباعی

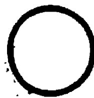
تیری ہے جہاں گیر لطافت اُردو
تو شاہِ جہاں کی ہے امانت اُردو
دُشمن کی زباں پر بھی تو چڑھ جاتی ہے
تجھ میں وہ خدا داد ہے طاقت اُردو

ہشیار کو دیوانہ بناتا ہے زمانہ
دیوانے کو ہشیار بنایا نہیں جاتا

فطرت میں جو پیوست ہے ظلمت نہیں جاتی
اندھے کو اندھیرے سے ڈرایا نہیں جاتا

منت کشِ استاد نہیں درسِ محبت
پڑھنے میں تو آتا ہے پڑھایا نہیں جاتا

دِل سوزِ محبت سے جلاتا ہے حاویؔ
کیا آگ میں سوتے کو تپایا نہیں جاتا



رُباعی

کیا عرض کروں مَیں تری نسبت اُردو
تیری تو اٹھان ہے قیامت اُردو
تا حشر رہے گا بول بالا تیرا
مٹ سکتی نہیں تو کسی صورت اُردو

کس سے کہتے جو حال ہے اپنا
کون اب ہم خیال ہے اپنا

سب یہ آئینہ قال ہے اپنا
قال ہی عین حال ہے اپنا

فطرتِ مشتِ خاک بھی ہے یہی
خاک ساری کمال ہے اپنا

ہوں فقط تیری ذات کا طالب
سب سے اونچا خیال ہے اپنا

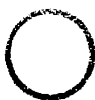
موت پر کیوں نہ جان دوں اپنی
وصلِ جاناں وصال ہے اپنا

دن پھریں گے کبھی ہمارے بھی
بس یہی اک سوال ہے اپنا

دونوں عالم کو گھیرنے والا
ایک جامِ سفال ہے اپنا

وہ تصور میں آ نہیں سکتے
خواب ہے جو خیال ہے اپنا

سچ ہے حاوی یہ قولِ حضرتِ فیض
"آج جینا محال ہے اپنا"



سوچ لیجیے بھلا بُرا اپنا
کہیئے پھر اُن سے ماجرا اپنا

ہاتھ پھیلائیے کوئی کیا اپنا
کھو چکی ہے اثر دُعا اپنا

تیرے قدموں سے تو جُدا نہ رہے
سر اگر تن سے ہو جُدا اپنا

آپ ہی کو جو مُدعا سمجھے
وہ کہے کس سے مُدعا اپنا

وہ بھی کرتے ہیں جُستجو تیری!
نہیں مِلتا جنھیں پتا اپنا

اُن کے جور و ستم کے صدقے میں
حوصلہ اور بڑھ گیا اپنا

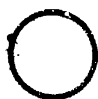
آپ بے کار بھی جو رہتے ہیں
کام کرتی ہے ہر ادا اپنا

چلنے والے ہوا کے رُخ پہ دیکھ
رُخ نہ بدلے کہیں ہوا اپنا

دل کو سمجھا تھا بے خیالی میں
ہم خیال اور ہم نوا اپنا

تو دُعا مانگ، مانگنے والے
مانگ لے گی اثر دعا اپنا

جب سے وہ دوسرے بنے حاوی
نہ بنا کوئی دوسرا اپنا



رُباعی

آواز میں ہے سوز و گدازِ احساس
پستی سے نُمایاں ہے فرازِ احساس
بے حِس ہے زمانہ تو سُناؤں کس کو
نالہ ہے مرا زمزمہ سازِ احساس

ساتھ جب تک تھا کوئی، حاصل مجھے کیا کچھ نہ تھا
اب تو ہوں اس وسوسے میں تھا بھی کچھ یا کچھ نہ تھا

بات کیا تھی کیوں ٹرکا سا دے دیا مجھ کو جواب
میں نے تجھ سے ہاتھ پھیلا کر تو مانگا کچھ نہ تھا

سچ تو یہ ہے آپ خود اپنے تماشائی بنے
ورنہ دنیا کے دکھانے کو تماشا کچھ نہ تھا

ایک آنسو نے ڈبویا ضبطِ غم کے نام کو
بوند بھر پانی کے آگے قعرِ دریا کچھ نہ تھا

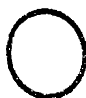
تم مری دنیا بنے تو بن گئی دنیا کچھ اور
پہلے میرے ذہن میں مفہومِ دنیا کچھ نہ تھا

مہر و قہر و سحر و شرم و ناز و شوخی و غرور
تھا سبھی کچھ یوں تری آنکھوں میں گویا کچھ نہ تھا

نام رکھتے ہیں اُسی شئے کا جو کچھ ہوتی بھی ہے
کیا ہے پھر اسمِ عدم؟ جب خود مُسمّیٰ کچھ نہ تھا

طالبِ دیدار سب جلوے سے کیوں محروم ہیں؟
پردے آنکھوں میں تھے آنکھوں پر تو پردا کچھ نہ تھا

کچھ سمجھ کر ہی کیا تھا ترک تو نے میل جول
دل میں حاوی کے تو اے جانِ تمنا کچھ نہ تھا



اپنی توہین سمجھتا ہے نہاں ہو جانا
فطرتِ عشق میں داخل ہے عیاں ہو جانا

لے کے دِل یوں ترا پیوست بہ جاں ہو جانا
بن گیا سود مرے حق میں زیاں ہو جانا

پہلے سُن لیجئے مرے آنے کا مقصد کیا ہے
قصد پھر آپ کے جانے کا جہاں ہو جانا

کر دیا آپ نے چُپ حکمِ زباں بندی سے
اور نظروں کو جو آتا ہے زباں ہو جانا

بے نیازی ہے تمہاری یہ گماں ہوتا ہے
چاہتے تو نہیں اللہ میاں ہو جانا

درد مندوں میں ترے شان ہے خودداری کی
یہ سکھاتے ہیں خموشی کو فغاں ہو جانا

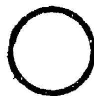
خود بخود نام ترا کیوں نہ زباں پر آئے
اقتضا نام کا ہے وردِ زباں ہو جانا

فائدہ سب کو پہنچتا ہے تو ہنگامِ کلام
تجھ کو لازم ہے زمانے کی زباں ہو جانا

پائمالوں پہ ترے ختم ہے ایسا ایثار
سب سے ممکن نہیں بے نام ونشاں ہو جانا

کر دیا اُس نے زمانے سے مجھے مُستغنی
بخششِ غم ہے متاعِ دل وجاں ہو جانا

خدمتِ ملک ووطن کا ہے وہ جذبہ ہادی
ہم سے بوڑھوں کو بھی آتا ہے جواں ہو جانا



رُباعی

آجا تو مرے سامنے آجا اے دوست
پنہاں رہے کیوں تیرا سراپا اے دوست
جلوہ ہے جہاں ضعفِ بصارت کا علاج
جائز ہے وہاں کیا ترا پردا اے دوست

بڑھ جائے نہ کیوں گرمیٔ بازارِ تمنا
مفلس بھی تو ہوتے ہیں خریدارِ تمنا

مطلوب ہو جب لذتِ آزارِ تمنا
کیوں طالبِ صحت رہے بیمارِ تمنا

پڑتی ہیں جہاں اُن کی لگاوٹ کی نگاہیں
پیدا وہیں ہو جاتے ہیں آثارِ تمنا

آزاد جو اپنے کو سمجھتے ہیں جہاں میں
وہ بھی نظر آتے ہیں گرفتارِ تمنا

دل آپ ہی ہوتا ہے تمنا کا محل بھی
پھر آپ ہی کہلاتا ہے معمارِ تمنا

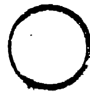
جو نقش بھی بنتا ہے وہ مٹتا ہے ابھر کر
کیا قابلِ عبرت ہیں کردارِ تمنا

ہو جاتا ہے جب خونِ تمنا تو کہوں کیا
یہ ہے مری دانست میں ایثارِ تمنا

"ہمت نخورد نیشترِ لا و نعم را"
خود داروں کا شیوہ نہیں اظہارِ تمنا

دل اور تمنا نہ ہو باور نہیں آتا
ممکن ہی کسی سے نہیں انکارِ تمنا

کس طرح چھپاؤ گے تمناؤں کو حاوی
ٹھہرے جو غزل حاملِ اشعارِ تمنا



مکانِ دل کا احاطہ کب اس جہاں سے ملا
اسی کا رقبہ ہے ایسا جو لامکاں سے ملا

فروغ جھوٹ کو سچ سچ تری زباں سے ملا
ملا زمین کے قلابے آسماں سے ملا

نہ پوچھ اس کو شبِ وعدہ کس طرح گزری
مجھے سحر کا پتہ صبح کی اذاں سے ملا

اگر ستم کوئی سہواً حضور سے چھوٹا
بطورِ تحفہ وہی مجھ کو آسماں سے ملا

کبھی تو دیکھ مرے خونِ آرزو کی بہار
کبھی تو آنکھ مری چشمِ خوں فشاں سے ملا

وہ نیم نالہ جسے نارسا ہی سمجھا تھا
مری زبان سے نکلا تو آسماں سے ملا

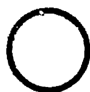
ہر ایک آپ سے کہتا ہے داستاں اپنی
یہ کہیے لطفِ سخن کس کی داستاں سے ملا

ہمیشہ جینے کی حسرت جو دل میں ہے اے شیخ
یہ پوچھو خضر سے کیا عمرِ جاوداں سے ملا؟

بڑائی اپنی جتانے کو غیر کہتا ہے
مری فلاں سے ملاقات ہے، فلاں سے ملا

نہ جانے بے خودیِ شوق لے گئی تھی کہاں
نہ اس جہاں سے ہی ٹوٹا نہ اُس جہاں سے ملا

زمانے والے سبق لیتے ہیں زمانے سے
سبق زمانے کو حاوی کی داستاں سے ملا



رُباعی

اُٹھتی ہوئی ہر موج کہاں ہوش میں ہے
ہر آن سمندر ہی کے آغوش میں ہے
ادراکِ معیت ہے کچھ ایسا حاوی
انا الی البحر بڑے جوش میں ہے



دشمن پہ میری طرح بگڑنے سے کیا ہوا
معشوق اس کے تم نہ ہوئے دوسرا ہوا

ہیں مبتلا ہوا بھی تو نقصان کیا ہوا
یہ دل اگر مرا نہ ہوا آپ کا ہوا

تحریف آج حضرتِ دل تم نے خوب کی
جو حرف بھی زباں سے نکس کی ادا ہوا

یہ تیری آنکھ بھی ہے بلا کی نظر فریب
کس کس کو دیکھتا ہوں اسے دیکھتا ہوا

واعظ سے پیرِ مرد کو کیوں رلم لگائیں ہم
ہم حور کا مرید اگر پارسا ہوا!

حاوی جو اس قدر ہے مضامین کی تلاش
شاعر بھی ہونا آپ کے حق میں بُرا ہوا





نئی تہذیب کا اب اس سے بڑھ کر کیا اثر ہوگا
نمایاں عیب جو ہوگا بہ عنوانِ ہنر ہوگا

جو ادراکِ حقائق ہے وہ استعداد پر ہوگا
رہے گا جس کا جتنا ظرف اتنا بہرہ ور ہوگا

تصور کس کا، سودا کس کا، دھن کس کی، لگن کس کی
وہی مدِ نظر ہوگا جو منظورِ نظر ہوگا

زمانہ ہوگیا ابلیس کی تلبیس پر مائل
یہاں جو راہ زن ہوگا بہ شکلِ راہبر ہوگا

نصیحت خواب کی تعبیر ہے عشاق کے حق میں
جنابِ شیخ! سیدھی بات کا الٹا اثر ہوگا

یہی افسانۂ طولِ امل کیوں زندگی اپنی
یہ قصہ پاک ہو جائے تو شاید مختصر ہوگا

نقابِ رخ ہے اُن کا پردہ دارِ ضعفِ بینائی
بصارت کام کیا دے گی جہاں نقصِ بصر ہوگا

اگر ذوقِ طلب میں گم ہوا سالک تو جا پہنچا
یہ ہے وہ راہرو جو آپ اپنا راہ بر ہو گا

فریبِ جستجو مجھ کو نہ ڈال اِس وسوسے میں تو
یہاں دیکھو، وہاں ڈھونڈو، اِدھر ہو گا اُدھر ہو گا

جہاں کون و مکاں کی وسعتیں محدود ہو جائیں
وہاں ارشاد ہے ٹوٹا ہوا دل میرا گھر ہو گا

یہ کیسا اہتمام حفظِ اسرارِ الٰہی ہے
کہ اِن سے باخبر ہے کون ہر اک بے خبر ہو گا



رُباعی

پختہ جو شعورِ بندگی ہو جائے
پھر آپ نصیب یکسوئی ہو جائے
ہو سکتی نہیں موت بھی اپنی دشمن
جب خود غمِ دوستؔ زندگی ہو جائے



جہاں ہر ایک حربہ نفس ہی کا کارگر ہوگا
وہاں یہ معرکہ تائیدِ غیبی ہو تو سر ہوگا

تجھے جو پا گئے وہ چھا گئے ساری خدائی پہ
یہ کیسا دل، یہ کیسا حوصلہ کیسا جگر ہوگا

ترے آشفتہ ہر درد و الم کی حد سے باہر ہیں
جہاں سر خود وبالِ دوش ہو کیا دردِ سر ہوگا

برائی نفس ہی سے لازم و ملزوم ہوتی ہے
یہاں تو لفظاً و معناً بشر کے ساتھ شر ہوگا

جہاں شک ہو دلائل کی ضرورت پیش آتی ہے
جہاں علم الیقیں ہو کیوں "اگر" ہوگا "مگر" ہوگا

فریبِ جنس و معراجِ نظر صورت پرستی ہے
کھلے گا جس پہ یہ معنیٰ وہی بالغ نظر ہوگا

دکھاؤں کس کو آب و تاب میں اشکِ ندامت کی
فرشتے لیں گے ہاتھوں ہاتھ یہ ایسا گہر ہوگا

نظر قیدِ جہت میں، ہر جہت سے تو منزّہ ہے
کسے ذوقِ نظر کہتے ہیں کیا ذوقِ نظر ہوگا

سبک ہوں دونوں عالم کیوں نہ میری سرگرانی سے
انھیں کیا علم تیرا سنگِ در ہی میرا سر ہوگا

بصارت کو بصیرت سے بدل لو دیکھنے والو
شہودِ حق تمہیں چونسٹھ گھڑی آٹھوں پہر ہوگا

جسے کہتے ہیں محشر اُن کا جشنِ رونمائی ہے
قیامت خیز جلوہ دیکھنے پر منحصر ہوگا

نہ ہو کیوں اعتبارِ نام پر قدرِ سخن حادی
روایت مستند ہوگی جو راوی معتبر ہوگا



رُباعی

مانو کہ نہ مانو یہ خیال اچھا ہے
قائل اگر اچھا نہیں قال اچھا ہے
انسان میں پیدا ہو اگر فخرِ عروج
بدلے میں عروج کے زوال اچھا ہے

درد خود دل کا مداوا ہو گیا
آپ ہی اپنا مسیحا ہو گیا

اپنا دیوانہ بنایا آپ نے
وہ مرا فرزانہ پن کیا ہو گیا

کس کو دیکھوں گا وہاں تیرے سوا
میں جہاں دانستہ اندھا ہو گیا

اب کہاں جنگل میں منگل اے جنوں
گھر ہی اپنا رشکِ صحرا ہو گیا

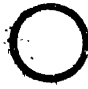
تیرا جلوہ بھی ہے گویا معجزہ
تھا جو نابینا وہ بینا ہو گیا

بےخودی میں تھے وہ مجھ سے بے حجاب
ہوش جب آیا تو پردا ہو گیا

وہ صدائے دار ناحق ہی سہی
آپ کا تو بول بالا ہو گیا

تم عیادت کے لیے کیا آ گئے
خود بخود بیمار اچھا ہو گیا

رشک اس قطرے پہ حاوی کیوں نہ ہو
مل کے دریا میں جو دریا ہو گیا



دل کو تقرب آپ کا منظور ہو گیا
نزدیک مجھ سے تھا کبھی اب دُور ہو گیا

وہ پاس آ گئے کوئی مسرور ہو گیا
نظریں جو مل گئیں تو گلہ دُور ہو گیا

انسانیت سے آدمی جب دُور ہو گیا
برعکس نام زنگی کا کافور ہو گیا

اک آپ ہیں کہ اوروں کے دل پر ہے اختیار
اک ہیں جو اپنے دل سے بھی مجبور ہو گیا

بزمِ عدو میں اُن سے ملاقات کیا ہوئی
ممنونِ دوست غیر کا مشکور ہو گیا

روحِ نشاطِ مے کدہ ساقی کی آنکھ ہے
جس پر پڑی نگاہ وہ مخمور ہو گیا

اُس پر بھی کوئی حدِ شریعت ہے شیخ جی
ساقی کی اک نظر سے جو مخمور ہو گیا

کیا قیس کا مقام کہاں شہرتِ دوام
صحرا نشیں رہا بھی تو مشہور ہو گیا

اس شدّ و مد کے ساتھ ہے کیوں آرزوئے دید
اک تجربہ تو پہلے سرِ طور ہو گیا

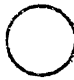
دیکھا ہے کس نے اُس کو دمِ سیرِ باغ میں
نرگس کا دیدہ کھلتے ہی بے نور ہو گیا

پہنچا جو گرتے پڑتے کوئی تیرے در کے پاس
خود پاسباں بٹھانے پہ مجبور ہو گیا



رباعی

تشویش بڑھی اور۔ جو فرزانہ بنے
تکلیفِ خرد چھوڑ کے دیوانہ بنے
ہوتا ہے جہاں دروغ ہی کو فروغ
کیا سچ ہے وہاں آدمی سچا نہ بنے؟



جرأت فزا مقولۂ منصور ہوگیا
یاروں کو لب کشائی کا مقدور ہوگیا

آئینے سے جواب جو اُس کا نہ بن پڑا
وہ اور اپنے حُسن پہ مغرور ہوگیا

مجنوں سے پوچھے کوئی قدر اُس جنون کی
جو بارگاہِ عشق کا دستور ہوگیا

کس کو نصیب تیرے گداؤں کے مرتبے
ہر کاسہ لیس غیرتِ فغفور ہوگیا

فرہاد کو نہ مل سکا پرویز کا مقام
حیلے میں جوئے شیر کے مزدور ہو گیا

کیا پیکرِ جمال ہے یہ آدمی نژاد
آنکھیں بڑی بڑی جو ملیں حور ہوگیا

سرمایہ دارِ دردِ محبت بنا ہے دل
اب یہ غریب صاحبِ مقدور ہوگیا

آئینہ ڈھونڈتا ہے ترے حُسن کی مثال
یا تجھ کو مُنہ دکھانے سے معذور ہو گیا

یہ ساری کائنات جب آئینہ بن گئی
ناظر خود اپنا آپ ہی منظور ہو گیا

پہلے بھی کم نہیں تھا اُسے حسن پہ غرور
معشوق بن کے اور بھی مغرور ہو گیا

حاوی جو دل پہ داغ محبت کا ثبت ہے
میرے لیے یہ کاغذِ ممہور ہو گیا!



رُباعی

سوکھے ہوئے پتے جو کھڑک جاتے ہیں
بے حوصلہ فی الفور جھجک جاتے ہیں
دورِ تاریخ لاکھ تاریک سہی
باحوصلہ کچھ اور چمک جاتے ہیں

ردیف (ث)

کیوں رنج مول لیتے ہیں بے کار بے سبب
یہ بحث ہے فضول یہ تکرار بے سبب

ہے شکوۂ عداوتِ اغیار بے سبب
وہ خود ہوتے ہیں برسرِ پیکار بے سبب

نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے
لڑنے کو آپ ہو گئے تیار بے سبب

سمجھے نہ وجہ بحث مگر ہو گئے دخیل
اُن کے ہمارے بیچ ہیں دو چار بے سبب

کیوں خواہ مخواہ رنج اُٹھائیں جہاں کے
اپنے کو کیوں بنائیں گراں بار بے سبب

کچھ تو ہے کوئی وجہ روابط ضرور ہے
ہم سے بھلا عدو کو سروکار بے سبب

موضوع بحث ہیں جو بتوں بزم یار میں
پھر کیوں رہے گا مجمع اغیار بے سبب

بے وجہ میں ہی آپ کا ہوں موردِ عتاب
غصّہ مجھی پہ ہے میرے سرکار بے سبب

پھر دل گھرا ہے حسرت و ارمان و شوق میں
پھر ہے یہ دوستوں میں گرفتار بے سبب

عشاق کیوں زمانے میں مد فضول ہیں
پیدا نہیں ہوا کوئی بیکار بے سبب

بے وجہ تم اگر ہو طرف دار غیر کے
میں کیوں بنوں گا اس کا طرف دار بے سبب



قطعہ

قطرۂ اشک اپنی پلکوں میں
گوہر آبدار ہوتا ہے
سلسلہ اِس کا ٹوٹتا ہے جہاں
یہ گلے کا کبھی ہار ہوتا ہے

(حاؔدی)

مجھ سے اُلجھ رہے ہیں وہ بے کار بے سبب
تکرار کیا کروں کہ ہے تکرار بے سبب

جب ہے کسی کے عارض و گیسو میں میل جول
پھر کیوں نزاع کافر و دیندار بے سبب

حُسنِ ملیح یار سے کیوں تلخ کام ہیں
خوبانِ دہر کیوں ہیں نمک خوار بے سبب

پڑتے ہیں پانو لوگ عقیدت سے شیخ کے
یا اُن کو کرتے ہیں یہ گنہگار بے سبب

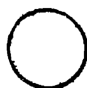
عاشق سے چل ہو مسئلہ کیا جبر و قدر کا
مجبور بے سبب نہ یہ مختار بے سبب

دیتے ہیں جان حُسن فروشوں پہ یار لوگ
لیتے ہیں مول جان کا آزار بے سبب

میں ان کے اس تبسمِ پنہاں پہ لوٹ ہوں
پیدا نہیں یہ سُرخیِ رُخسار بے سبب

دشمن کو سرکشی نے دکھایا ہے روزِ بد
ورنہ حضور آپ کی پھٹکار بے سبب

خود شاعری محرکِ جذبات ہو گئی
حادی نہیں یہ آپ کے اشعار بے سبب



ہے ان کی یاد میں نسیان غائب
خطا کا ہو گیا امکان غائب

وہیں کھلتا ہے کچھ سرِّ مشیّت
جہاں ہو دل کا ہر ارمان غائب

نہیں بندے کا پھر ہوتا ہی کوئی
اگر ہو بندگی کی شان غائب

تلاوت میں تدبر ہی نہیں ہے
دلوں سے ہو گیا قرآں غائب

دیا اسلام نے ایمان بالغیب
مسلمانوں میں ہے ایمان غائب

ہے غیب غیب ہیں شاہد نہ مشہود
یہاں عارف ہے گم عرفان غائب

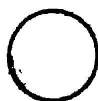
نماز اپنی بنے کس طرح معراج
ہے تعلیمِ وما الاحسان غائب

وہاں وجدان کا مفہوم کیا ہے؟
جہاں ہو جاتے ہیں ادیان غائب

تجلّیٔ طور پر جس دم ہوئی تھی
کہاں تھے ہوش عمرانؑ غائب؟

ہے اَلتّوحید اسقاط الاضافات
دلیل و حجت و برہان غائب

مضامین غیب کے لکھتے ہو حادی
نہ ہو جائے کہیں دیوان غائب



قطعہ

پرتوِ خور سے ہی تابندہ مثلِ آفتاب
ذرّہ ذرّہ ہے جو بڑھ سکتا نہیں حدِ مقدار سے
آس غیرِ یاس کیا اُس قوم کے کردار سے
جس نے بدلا اپنے ہی اقبال کو اِدبار سے

کھائیں نہ کس طرح مرے دل اور جگر فریب
صورت ہی اس نے پائی ہے ایسی نظر فریب

ہے شکل دلفریب تو آنکھیں نظر فریب
پھر کس طرح بشر سے نہ کھائے بشر فریب

باتیں ہیں دل فریب ادائیں نظر فریب
ہم کو کسی نے لوٹ لیا ہے بہر فریب

وہ آگئے ہم اُن کی ندامت کو پا گئے
کس وقت کی یہ اپنی دُعا تھی اثر فریب

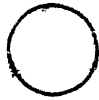
دیتا ہے دل کا ساتھ جگر بھی خوشی کے ساتھ
قسمت سے دردِ دل بھی ملا ہے جگر فریب

دھوکے میں ہے ہر ایک کہ ہم پہ نگاہ ہے
یہ تیری آنکھ بھی ہے عجب مختصر فریب

کیا جانیں آپ وعدہ و پیماں وعہد و قول
ہاں ہاں دیا گیا ہے کسی کو مگر فریب

دھوکا نہ کھائے یہ دلِ ناداں تو کیا کرے
ہے تیری بات بات میں اے فتنہ گر فریب

جھوٹ ہو ما شقی ہیں کہ ہو شعر میں غلو
ہے شاعروں کا عیب بھی حادی ہنر فریب



پھر کیوں نہ دے ہمیں وہ فریب آشنا فریب
کھاتے ہیں اور کھا کے بھی ہم بار ہا فریب

میں اور ہائے ہائے مرے دل کی سادگی
اس نے دیا فریب تو یہ کھا گیا فریب

اس کی نگاہ ناز سے بچتا نہیں کوئی
نا آشنا فریب بھی ہے آشنا فریب

تیری ہر ایک بات میں اک گھات ہے نئی
تیرے ہر ایک کام میں ہے اک نیا فریب

دنیا میں کیوں حسینوں پہ ہے سب کو اعتبار
حالانکہ کرتے ہیں یہی بے انتہا فریب

دنیا سے پہلے ہاتھ اٹھا لو جناب شیخ
بنتے ہیں پھر یہ دست دعا خود دعا فریب

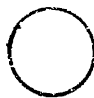
آنکھوں میں وہ خمار کہ سو میکدے نثار
پھر اس پہ شکل پائی ہے کیا پارسا فریب

کیا کیا نہیں تری نگہِ فتنہ ساز میں
دم، داو، گھات، چکمہ ہے دھوکہ دغا فریب

ہر اک قدم پہ فتنۂ محشر کا ہے یقین
رفتار ہے یہ اس کی قیامت نما فریب

دامِ فریب بال، قیامت فریب چال
القصہ ہے وہ شوخ زسرتا بپا فریب

حاوی ذرا تو کام لو عقلِ سلیم سے
کیوں ان بتوں کے کھاتے ہو مردِ خدا فریب



قطعہ

آنکھوں سے پھر بھی پردۂ غفلت نہ اٹھ سکا
گزرے ہیں کیسے کیسے مناظر نگاہ سے
دونوں ہیں شغلِ ترکِ خودی میں ہو کے بیخودی
مختص یہ میکدے سے ہے وہ خانقاہ سے



کون سمجھائے وہ کیوں کر ہے رگِ جاں کے قریب
فطرۃً رہتے ہیں انسان ہی انساں کے قریب

جانِ پروانہ سہی شمع، مگر اپنی جگہ
اُس میں یہ تاب جو آئے رُخِ جاناں کے قریب

اپنے عارض پہ جو بکھرا لئے اُس نے گیسو
کفر کو یوں بھی جگہ مل گئی ایماں کے قریب

چشمِ بد بیں میں یہ چبھ جاتے ہیں ہنگامِ نظر
خار بے کار نہیں ہیں گلِ خنداں کے قریب

پھونک دے تو ہی نشیمن کو مرے آتشِ گل
برق کی آنکھ مچولی ہے گلستاں کے قریب

دور کر دیتے ہیں سب دل سے ہو یا محفل سے
کون آتا ہے کسی بے سر و ساماں کے قریب

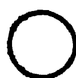
آشیانوں کو ہمارے یہ ملی ہے وسعت
وہ گلستاں میں ہیں اب جو تھے گلستاں کے قریب

سوز پروانوں کے دل ہی کا بنا تھا جاں سوز
جل کے ٹھنڈے جو پڑے شمعِ شبستاں کے قریب

لَو بھڑک کر کہیں دامن نہ جلا دے تیرا
بادِ صرصر ہے چراغِ تہِ داماں کے قریب

شمع ہم تیری رواداری کے قائل ہوتے
جھلملاتی جو کبھی گورِ غریباں کے قریب

آج موسیقی کی دُھن میں ہے ترنم حاوی
بیٹھ جائے کوئی سازندہ غزل خواں کے قریب



دو شعر

جبر ہے وجہِ افتخار مجھے
ورنہ مَیں ان کا اختیار مجھے؟
وجہ تسکینِ دل ہے ذکر ترا
بے قراری میں ہے قرار مجھے

ردیف (ت)

کوئی کس طرح سمجھے پوری بات ؟
آپ تو کرتے ہیں ادھوری بات

پھر یہ وعدہ خلاف کیوں نہ کہوں ؟
تم نے کی ہے کبھی بھی پوری بات ؟

ہمہ تن گوش بن کے سنتا ہوں
آپ کی بات پھر ادھوری بات

جا رہے ہیں تو کچھ نہیں کہتا
ٹھہرتے ہیں تو سنیئے پوری بات

تجھ سے میں بات پھر کروں کیا خاک
جب نہ کی تو نے مجھ سے پوری بات

منہ کے منہ میں وہ بڑبڑاتے ہیں
کوئی کیا خاک سمجھے پوری بات

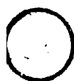
ملنا جلنا تو درکنار رہا
اب وہ کرتے نہیں ہیں پوری بات

اک میری بات واہیات فضول
اک تری بات ہے ضروری بات

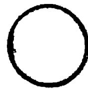
شعر اشعار سے بنایا ہے
ہے بُری بات اپنی بوری بات

آپ کا کام ہے ضروری کام
آپ کی بات ہے ضروری بات

ہوگیا حادی اپنا پورا کام
ہوتے ہوتے تک اُن کی پوری بات



"ہرچہ از دوست می رسد نکوست"
کیوں مصیبت ہو ناگوار مجھے



جُدا ہر زباں سے زبانِ محبت
الگ ہر بیاں سے بیانِ محبت

ہوئی کس سے حل چیستانِ محبت
دو عالم ہے کنزِ نہانِ محبت

اگرچہ ہے چُپ بے زبانِ محبت
ہیں آنکھیں کھُلی ترجمانِ محبت

خمار اور خمیازہ کہتے ہیں کس کو
نہیں جانتے مے کشانِ محبت

ہر اک عہدِ ماضی ہے ممنون اُس کا
وہ دلچسپ ہے داستانِ محبت

بتانے سے اُس کے ہے تاریخ عاجز
کہ ہے کب سے نام و نشانِ محبت

رہے قصۂ قیس کی کیوں نہ شہرت
ہر اک لفظ جس کا ہو جانِ محبت

ہے تنصیف اس میں تو توحید اُس میں
عدالت سے بڑھ کر ہے شانِ محبت

سمجھ لیتے چرواہے کی بات موسیٰؑ
شریعت جو ہوتی زبانِ محبت

چھری اور حلقوم لختِ جگر یہ
اسے کہتے ہیں امتحانِ محبت

مقامِ محبت ہے کچھ اور حسادی
یہاں اُنس پر ہے گمانِ محبت



دو شعر

آنکھ ہے محوِ تصور دل ہے پابندِ خیال
یعنی ہر اک اپنے کام میں مصروف ہے
عشق دل میں ہے کسی کا دل کسی کے عشق میں
ظرف کا یہ ظرف ہے مظروف کا مظروف ہے



اب کوئی آرزو نہیں بجز آرزوئے دوست
ہے گفتگو یہی کہ رہے گفتگوئے دوست

پہلو ہر ایک کلام کا ہے گفتگوئے دوست
ہر بات میں ہے روئے سخن اپنا سوئے دوست

شانِ بہار بڑھ گئی جانِ بہار سے
ہر ایک پھول میں ہے نہاں رنگ و بوئے دوست

کس طرح اپنے دل سے اسے میں جُدا کروں
ہے جان سے عزیز مجھے آرزوئے دوست

ہے اقتضائے حسرتِ دیدار بس یہی
وہ میرے روبرو رہے میں روبروئے دوست

عشاق زندگی ہی میں جنت نصیب ہیں
ہے رشکِ خلد و غیرتِ فردوس کوئے دوست

کوئی حسین اب نہیں جچتا نگاہ میں
آنکھوں میں بس گیا ہے میرے حُسنِ روئے دوست

ہوں رات دن اُسی کے تصور میں ہمکلام
ٹوٹے کبھی نہ سلسلۂ گفتگوئے دوست

دشمن بھی آج ہم کو دکھاتا ہے اپنی شان
کیوں اس پہ ہو گئی اثر اندازِ خوئے دوست

اب کھو دیا ہے عشق نے دُنیا جہان سے
اپنی تلاش ہے مجھے یا جستجوئے دوست

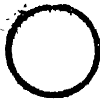
کس نے بسا دیا اُسے میرے دماغ میں
عادی ہر ایک سانس سے آتی ہے بوئے دوست



دو شعر

اچھا ہے علاوہ ہم کو بھی معلوم ہے لیکن
نبی بھی کسی شخص کی تعریف نہ کیجے

پابندیٔ اقرار کچھ آسان نہیں ہے
ہم خود ہی چلے آئیں گے تکلیف نہ کیجے



کیوں پریشان نہ ہو عاشقِ ناشاد بہت
ایک دل اور تمناؤں کی تعداد بہت

جب سکھاتے ہیں نئی بات سکھاتے ہیں مجھے
حضرتِ دل ہیں سبق دینے میں استاد بہت

غیر کیوں اپنی طرح اُس کی نظر سے گرتے
ایک ہم پر ہی محبت میں ہے افتاد بہت

آج کل اس نے طبیعت ہی نئی کرلی ہے
داد دینے کے تو قابل ہے یہ ایجاد بہت

یاس نے اب کسی حسرت کو نہ رکھا دل میں
یہ وہی گھر ہے کہ جو تھا کبھی آباد بہت

دوست ہمدرد اگر ہوں تو کوئی غم کیوں ہو
ایک سے دوسرے کو ملتی ہے امداد بہت

مُسکرا دیتے ہیں وہ دیکھ کے صورت میری
اب تو اے شوق تجھے مِل گئی امداد بہت

کیا جانیں یہ بدخلق، بداطوار محبّت
کرتے ہیں مگر آپ سے اغیار محبّت

کہلانے کی حد تک ہیں فقط چاہنے والے
کہنے ہی کی حد تک ہے فقط پیار محبّت

سائے کی طرح ہم بھی جدا ہو نہیں سکتے
رکھتی ہے ترے گھر کی بھی دیوار محبّت

اک چاہنے والے ہی کی چاہت نہیں بے کار
تم کو بھی تو اوروں سے ہے بے کار محبّت

گو خاتم العشاق نہ تھے کوہکن و قیس
پھر بھی نہیں دشمن کے سزاوار محبّت

آنکھوں پہ تصدق ہے لگا ہوں پہ فدا ہے
بیمار محبّت کی ہے بیمار محبّت

کیا طرفہ تماشہ ہے کہ ہم جان پہ کھیلیں
وہ کھیل سمجھتے ہی رہیں پیار محبّت

صدقے ترے اخلاق کے کیا بات کہی ہے
اخلاق میں داخل ہی نہیں پیار محبّت

کیوں دو دن کی لیتے ہو یہ کیا خبط ہے حاوی
کیا ایک تمہیں کو ہے مرے یار محبّت



تھوڑے سے مہر کے پردے میں ہے بیداد بہت
ہم بھی پہچانتے ہیں اے ستم ایجاد بہت

ان حسینوں میں یہ کیا رسم چلی آتی ہے
چاہنے والوں کو کرتے ہیں یہ برباد بہت

چاہنے والوں کو اپنے نہ رکھا شاد کبھی
حسن والو! تمہیں اللہ رکھے شاد بہت

اُنگلیاں اُٹھتی ہیں لوگوں کی جدھر جاتا ہوں
میری تعریف میں ہیں آپ کے ارشاد بہت

لب تک اب آہ بھی آئے تو گِلہ ٹل جائے
ہم بھی کرتے تھے کبھی نالہ و فریاد بہت

اب تک اے چرخ حسینوں کی جفا ہی نہ سہی
ترے غمزے بھی ہے اے ستم ایجاد بہت

آپ کا وعدۂ فردا تو قیامت نکلا
دلِ مضطر کو ہے اتنی سی بھی میعاد بہت

مکرِ پرویز سے بدنامی شیریں نہ گئی
کام تو کر گئی ناکامی فرہاد بہت

خالِ رخ اور ترے حسن کو لے اڑتا ہے
صفر سے ہوتی ہے افزائش اعداد بہت

دیدیا سب کو ہمیشہ کے لیے صاف جواب
کر دیئے آج غلام آپ نے آزاد بہت

کیا ہوا خونِ تمنا جو ہوا اے حادی
سر سلامت ہے مری جان تو جلّاد بہت



دو شعر

ان کو اگر گلے سے لگائیں نہ عید میں
وہ عید کیا ہے جو عید منائیں نہ عید میں
جز انبساط و عیش و طرب کچھ نہ ہو تو کیا
جو غم دیا ہے تم نے وہ کھائیں نہ عید میں

ردیف (ث)



نہ بتاتے ہیں وہ کچھ اپنی ہنسی کے باعث
نہ سمجھ میں مری آتے ہیں خوشی کے باعث

رنج بھی ہوتے ہیں دنیا میں خوشی کے باعث
یعنی رونا بھی تو پڑتا ہے ہنسی کے باعث

غیر کو آپ نے چاہا ہے سراہا ہے بہت
موت کے ہوں نہ سبب اسکی خوشی کے باعث

ہم کو عالم کی حقیقت سے سروکار ہو کیا
سب پہ روشن ہے تری جلوہ گری کے باعث

شرم، انداز، ادا، دیکھنے دیتے بھی نہیں
یہی ہوتے ہیں تری کم نگہی کے باعث

لاگ ہو خسروِ پرویز کو فرہاد سے کیوں
ہاں رقابت میں تو مجبور ہے جی کے باعث

دلِ دیوانہ کبھی گویا ہے لیلیٰ کا محمل
عشق کی سادی کرامت ہے اسی کے باعث

میری ہر بات پہ اس طرح ہنسی ٹھیک نہیں
کہیں خود آپ نہ ہوں اپنی ہنسی کے باعث

غیر سے مجھ کو نہ شکوہ نہ شکایت نہ گِلہ
آپ ہیں آپ میری دل شکنی کے باعث

لوگ اُس شخص کو دیوانہ کہا کرتے ہیں
جس کے جذبات ہوں آشفتہ سری کے باعث

اب وہ اگلی سی کہاں مشقِ سُخن اے حادی
اس پہ طرہ ہیں پھر افسردہ دلی کے باعث



دو شعر

مجھ سے تو وہ نہیں مِلے میں سب سے کیا مِلوں
اب میرے دوست مجھ کو ستائیں نہ عید میں

حاصل ہو ایسے لوگوں کو پھر لطفِ عید کیا
لذت جو تیری دید کی پائیں نہ عید میں

دامن ہے اشکِ خوں سے عجب لالہ زار آج
میرے لیے خزاں بھی ہے رشکِ بہار آج

چھینا ہے کس نے میرا سکون و قرار آج
ہر خوش گوار بات ہے ناخوش گوار آج

پوچھو نہ کچھ زمانے کی یہ سفلہ نوازیاں
بے قدر کل تھے جن کو ملا ہے وقار آج

گنتا ہوں آسمان کے تارے فراق میں
یہ شب ہے میرے واسطے روز شمار آج

یہ بے بسی بھی دیکھ مری اے نگاہِ دوست
قابو میں دل زباں پہ نہیں اختیار آج

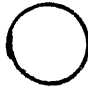
توبہ شکن بہار ہے تقویٰ شکن ہے یار
پرہیزگار بھی نہیں پرہیزگار آج

کہتے ہیں کیا اسی کو تقاضائے شوقِ دید
بے وعدہ کر رہا ہوں ترا انتظار آج

کل جو دکھائی دیتے تھے بامِ عروج پر
ملتا نہیں ہے اُن کا نشانِ مزار آج

حاوی ملے گا خود کفِ افسوس کل وہی
کھو دے جو اپنے ہاتھوں سے اپنا وقار آج

ردیف (ح)



کام آپ کا تھا اُس کو مناتے کسی طرح
روٹھا ہوا ہے آپ سے جو آپ کی طرح

پھر ہم سے پیش آئے وہ کیونکر بھلی طرح
اس پر ہمارا دل ہی جب آئے بُری طرح

اچھائی چاہتے ہو جو دُنیا جہان کی
دیکھو - جہاں بُرائی تو ٹوکو بُری طرح

جانِ نظارہ ہیں یہ تری طرح دار یاں
بڑھ چڑھ کے ایک طرح سے ہے دوسری طرح

رہتے ہیں جس میں آپ وہ دُنیا بُری نہیں
ہم سے تو پیش آتی ہے لیکن بُری طرح

تو لاکھ بار دولتِ دیدار کر عطا
بھرتی نہیں غریبوں کی نیت کسی طرح

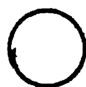
قائم نہ ہو سکا کوئی معیارِ حُسن کا
ہر اک طرح دار کی ہے اک نئی طرح

اچھا اسی کو کہتے ہیں سب لوگ ہے دوست
دشمن سے بھی جو پیش نہ آئے بُری طرح

آئینہ رُو ہیں آپ یہ سب پر ہے آئینہ
سینے میں دل بھی چاہیئے آئینے کی طرح

بدلا لباس اُس نے تو جلوے بدل گئے
سج دھج نئی ہے وضع نئی ہے نئی طرح

تو مکتبِ صفی کی نمائندگی نہ چھوڑ!
حاوی یہ ہے غزل کے لیے کوئی سی طرح



دو شعر

وہ باز آتے نہیں ہیں دشمنی سے
انھیں سمجھا چکے ہم دوستی سے

کہیں آتی ہے ہر اک پر طبیعت
محبّت ہوتی ہے بس ایک ہی سے

روٹھنا آپ کا جائز ہے روا ہے شاید
نازِ بے جا جو اٹھاتا ہوں بجا ہے شاید

قابلِ ظرف تڑپنے کے مزے ملتے ہیں
دردِ فرقت بھی محبت کی عطا ہے شاید

قیمتِ جنسِ وفا اپنی مشخص ہی نہیں
دوست خود دشمنِ اربابِ وفا ہے شاید

دل گیا آپ کے ہمراہ تو لوٹا ہی نہیں
راستہ گھر کا بھی یہ بھول گیا ہے شاید

کچھ نہیں زادِ رہِ عشق بجز گریہ و آہ
دوستو یہ اثرِ آب و ہوا ہے شاید

آج تک آپ سے بھی اس کا مداوا نہ ہوا
دردِ دل آپ ہی خود اپنی دوا ہے شاید

نامِ صہبا جو لیا آ گیا آنکھوں میں سرور
اس کے حرفوں میں بھی کچھ اس کا مزا ہے شاید

دل کے دو حرف خود آپس میں کبھی مل نہ سکے
اس لیئے یہ مرے پہلو سے جدا ہے شاید

تیرا حاوی جو طلب گار نہیں راحت کا
تلخیٔ غم کا مزا اس سے سوا ہے شاید

ردیف ر

گلستانِ جہاں میں پھول بھی ایسے کہاں ہونگے
تری فرقت کے جیسے داغ ہیں دل پہ کلیجے پر

وہی اک بات تسکینِ جگر ہے راحتِ دل ہے
وہی اک بات دل پہ تیر ہے نشتر کلیجے پر

کہیں دل کی طرح یہ بھی نہ جلنے پائے ہاتھوں سے
اب اپنا ہاتھ رکھ لیتا ہوں گھبرا کر کلیجے پر

یہ اچھا اضطرابِ عشق میں دونوں کا عالم ہے
کلیجہ دل پہ رہتا ہے دلِ مضطر کلیجے پر

تری اُلفت کا صدقہ کب کوئی محروم رہتا ہے
تصرف درد کا اب دل سے ہے بڑھکر کلیجے پر

یہ کیا دن ہیں نظر آتی نہیں وہ چاند سی صورت
وہ کیا دن تھے کہ رہتا تھا کسی کا سر کلیجے پر

محبت میں تو حاوی صبر تم سے ہو نہیں سکتا
اُنھیں کا دل ہے رکھ لیتے ہیں جو پتھر کلیجے پر



ترے دیوانے قائم رہ نہیں سکتے تکلف پر
بہک جاتے ہیں تھوڑے سے کرم ادنیٰ تلطف پر

پھٹا دامن تو ثابت اُس نے کر دی پاک دامانی
زلیخا نے لگایا تھا غلط الزام یوسفؑ پر

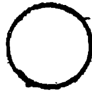
تغیر صورتوں کا نت نئے جلوے دکھاتا ہے
تصدق عشق ہے سرکار کے حسنِ تصرف پر

مری آنکھوں سے چھپ کے بے تکلف دل میں رہتے ہیں
نظر حیران ہے قربان حاؔدی اس تکلف پر

مرے مالک ترا عرفان کیا حاصل کرے کوئی
ترے بندے سمجھ میں آ نہیں سکتے تعارف پر

کہاں انسانیت، انسانیت کا خون ہوتا ہے
بدلتا رنگِ دنیا کاش اظہارِ تاسف پر

گُل و بلبل کے پردے میں نمایاں کر حقائق کو
جو تیری شاعری حاؔدی ہے عنوانِ تصوف پر



منقول آج کیوں نہ رہے ہر زبان پر
معقول حاشیے ہیں مری داستان پر

قُدرت اُنھیں کو دیتی ہے قُدرت بیان پر
غصّے میں بھی جو رکھتے ہیں قابو زبان پر

ایسی اثر نواز ہوئی داستانِ غم
آئی زبان پر تو بنی میری جان پر

ایسا پڑا ہے کال کہ جینا وبال ہے
برسات ہُن کی تھی کبھی ہندوستان پر

ٹھہرے جو آپ غیرتِ خورشید و رشکِ ماہ
پھر کیوں اُٹھے کسی کی نظر آسمان پر

وسعت ہے دل کی کیا یہ کسی اہلِ دل سے پوچھ
ہے رشکِ لامکاں کو بھی اس مکان پر

تعمیرِ آشیاں کی مرے اس قدر خوشی
بجلی بھی رقص کرنے لگی آسمان پر

عالم سے بے نیاز دو عالم میں سرفراز
وہ لوگ جن کا سر ہے ترے آستان پر

تاروں پہ یوں نظر شبِ وعدہ جمی رہی
جیسے وہ رشکِ ماہ بھی ہے آسمان پر

آتی ہے سازِ دل سے ترے نام کی صدا
آواز ٹوٹتی ہے اِسی ایک تان پر

حمّادی زبان کو بھی زباں داں پہ ناز ہے
اہلِ زباں کو ناز اگر ہے زبان پر



دو شعر

جو کر سکتے نہیں عرضِ تمنّا
ترا منہ تک رہے ہیں بے لبی سے

وہ بے رخ ہم سے یوں جیسے نہیں کچھ
تعلق آدمی کو آدمی سے

منصور کی طرح سے نہ بیولٹے دار کر
حق تجھ کو ہے عزیز تو پھر آشکار کر

اے دل تو پہلے علم و ہوا میں کر امتیاز
پھر اس کے بعد اپنا عمل استوار کر

مطلوب ہے اگر تجھے کچھ اپنی بہتری
تو ہر کسی کو اپنے سے بہتر شمار کر

جب تک کہ نفس میں نہ ہو پیدا شکستگی
جو کسرِ نفس کا ہو عمل بار بار کر

ہر ایک آرزو ہے تری لات اور منات
پھر تو خدا پرست ؟ ذرا ننگ و عار کر

حدِ عبودیت سے نہ آگے بڑھا قدم
تو اپنے مستقر ہی پہ سب کار و بار کر

ذکرِ خدا میں دل کی حضوری بھی شرط ہے
دھوکہ نہ دے خدا کو زباں سے پکار کر

ترکِ ہوائے نفس ہے اصلِ مجاہدہ
مرتا ہے نفس شیخ جی! دیکھو تو مار کر

شہرت کی آرزو میں نہ بن جا ہنر فروش
حادی عیوب کو نہ چھپا آشکار کر

طریقِ عشق میں پروائے جانِ زار نہ کر
جو تجھ کو جان ہے پیاری کسی سے پیار نہ کر

یہ تیری فکر کے لائق نہ ذکر کے قابل
نہ کر شکایتِ غم ہائے روزگار نہ کر

ہماری جان ہے کیا چیز لے کے بن انجان
کیسے شکار کیا ہے یہ آشکار نہ کر

نہ کھا ضمیر کا تو جان بوجھ کر دھوکا
کبھی ضمیر پہ دانستہ اعتبار نہ کر

کبھی یہ کرتے ہیں برباد غنچہ و گل کو
ہوا کے جھونکوں سے اندازۂ بہار نہ کر

خزاں میں لے تو بہار آفریں نگاہ سے کام
مگر نگاہ کو شرمندۂ بہار نہ کر

ادائیں دیکھ کے اس کی ادا شناس بھی بن
فقط اداؤں کی گنتی نہ کر شمار نہ کر

نہ گزرے حدِ ادب ہی سے دیدۂ حاوی
سنور سنور کے اُسے تو قصوروار نہ کر

اُٹھے نہ حشر شوخیِ رفتار دیکھکر
رکھنا قدم ذرا میرے سر کا دیکھکر

جلوے ہیں بے حجاب مگر طالبانِ دید
محجوب ہیں نگاہ کا معیار دیکھکر

بڑھتے ہیں حوصلے جو نشیب و فراز ہو
کترا رہا ہوں راہ کو ہموار دیکھکر

افتادِ طبع اُن کی سمجھنی محال ہے
اندازہ لوگ کرتے ہیں آثار دیکھکر

پہلو میں ہے وہ۔ بات کا پہلو کوئی نکال
چُپ چاپ کیوں ہے فرصتِ گفتار دیکھکر

آنکھیں خدا نے دی ہیں چلو دیکھ بھال کے
بدلو روش زمانے کی رفتار دیکھکر

صورت پہ میری کیوں نہ ہو تصویر کا گُماں
محفل میں تیری نقش بہ دیوار دیکھکر

مرنے دے مرنے والوں کو اُن کا ملال کیا
فتنے تو بھی اُٹھے تیری رفتار دیکھکر

حاوی جب اُن کے زانو پہ سر ہے تو سوجھی حیا
کیوں جاگتا ہے بخت کو بیدار دیکھکر

ردیف (ز)

باسلیقہ گفتگو، آدابِ محفل کی تمیز
قول سے معلوم ہو جاتی ہے قائل کی تمیز

"قدرِ جوہر شاہ داند یا بداند جوہری"
ایک بے دل کیا کرے گا صاحبِ دل کی تمیز

ہٹ گیا آگے سے آئینہ تو یہ بھی ہٹ گیا
دیکھ لی سرکار نے اپنے مقابل کی تمیز

حق و باطل میں کہاں باقی رہا اب امتیاز
اُٹھ گئی دُنیا سے شاید حق و باطل کی تمیز

زندگی کا آج پیچیدہ ہے ہر اک مسئلہ
حل کرے کوئی اگر ہو ان مسائل کی تمیز

اپنی تہذیبِ گزشتہ اک فسانہ بن گئی
اب کہاں اہلِ دکن میں وہ اوائل کی تمیز

شعر کہنا یوں تو اے حاویؔ بہت آسان ہے
ہوتی ہے مشکل پسندوں کو مشکل کی تمیز

ردیف (ش)

ہے اُسی کے دم سے منزل کی تلاش
دل ہے سرِّ غیب کر دل کی تلاش

بالیقیں ہر موج نے رازِ فنا
ہے جو بے تابانہ ساحل کی تلاش

علّتِ زاغَ البصر کیا عام ہے
حق کے دھوکے میں ہے باطل کی تلاش

ہر کس و ناکس کے لب پر ہے "آنا"
ہو سکی لیکن نہ قائل کی تلاش

ہے جو انفس میں وہی آفاق میں
سعیٔ لاحاصل ہے حاصل کی تلاش

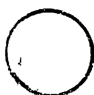
دل کے اک پہلو میں ہے کل کائنات
تجھ کو پہلو میں ہے کیوں دل کی تلاش

مانگنے والوں کے منہ قابل کہاں
ہے کرم کو اُن کے سائل کی تلاش

نصِّ قرآنی سے قربِ حق کو دیکھ
کر نہ خارج میں وسائل کی تلاش

عبدیت ہی میں ربوبیت بھی ہے
کیجیے حاوی حدِ فاصل کی تلاش

ردیف (ک)



جب اپنے ہاتھ بڑھ سکتے نہیں اپنے گریباں تک
جنونِ عشق کیا پہنچائے گا ہم کو بیاباں تک

اٹھا تقلید کو راہ سے ہاتھ اے آبلہ پائی
یہ تیری دوڑ آخر کب تک اے ظالم بیاباں تک

اسے ناکامیوں نے اور دیوانہ بنایا تھا
نہ جاتا ورنہ وحشت کے سبب مجنوں بیاباں تک

مہیا ہیں کے ساماں اکٹھے رنگ وحشت سے
ہم اب اے وحشتِ دل جا نہیں سکتے بیاباں تک

انھیں رحمت نے پہنچایا تو وحشت تجھ کو لے نکلی
وہاں گھر سے گلستاں تک یہاں گھر سے بیاباں تک

ترا دیوانہ آخر اپنے مطلب کا سیانا ہے
یہ وہ مجنوں نہیں ہے جو فقط پہنچا بیاباں تک

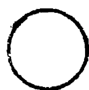
ترقی پر لگی ہے اور میری خانہ ویرانی
کہو دیوانہ تجھ کو جاؤں جو ڈھونڈنے بیاباں تک

اکیلے ہم تو ایسے راستے طے کر نہیں سکتے
جنوں کا ساتھ رہتا ہے جو جاتے ہیں بیاباں تک

بھلا ہم کیا ہمارا چار انگل کا گریباں کیا
نہ چھوٹا پنجۂ وحشت سے دامانِ بیاباں تک

نہ اب وہ اپنی حالت ہے نہ اب وہ دل کی وحشت ہے
مگر اک وضع ہے جاتے ہیں جو اب تک بیاباں تک

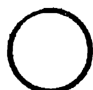
غزل میں اپنی حادی کیوں نہ ہوں مضمون وحشت کے
رسائی قافیے نے بھی تو پائی ہے بیاباں تک



دو شعر

دل جو پہلو میں ہے وہ ٹوٹا ہوا اک ساز ہے
غور سے سننا پڑے گا مضمحل آواز ہے
کوئی سمجھے یا نہ سمجھے بات حادی کی مگر
اپنی ژولیدہ بیانی پر تو اس کو ناز ہے

ردیف [ل]



فسانۂ گل و بلبل نہیں بنائے غزل
ہزار طرح کے مضمون ہیں برائے غزل

ہر ایک صنفِ سخن سے جدا نوائے غزل
کہاں یہ شوخیٔ گفتار ماسوائے غزل

جو زندگی کے مسائل ہیں اُن کو حل کیجیے
تقاضے وقت کے ہیں آج رہنمائے غزل

بیان یہ ہو جو قدرت نئی نئی راہیں
نکال لیتے ہیں پابندتنگنائے غزل

نہ ہو مفید تو ہے ننگِ صفحۂ قرطاس
غزل برائے ادب یا ادب برائے غزل

گزر چکا ہے زمانہ وہ میر و مرزا کا
ہے اجتہاد طلب آج کل فضائے غزل

ہو کیوں نہ میر کی ہر بات میرا اے حاوی
یہ تھا خدائے سخن اور ناخدائے غزل

کہتے ہو جس صفائی سے تم ہیں ہوں صاف، دِل
کرتا ہے اُس صفائی سے کیا اعتراف دِل؟

دل کی موافقت میں ہوں دُنیا کے ہیں خلاف
تیری موافقت میں ہے میرے خلافِ دِل

جُنبش میں رات دن یہ برائے حیات ہے
یا دل میں تو ہے کرتا ہے تیرا طواف دِل

تو خود ہے دل نشیں تو خطا اُس کی دیکھ لے
کرتا نہیں زباں سے اگر اعتراف دِل

وہ جانتے ہیں بال کی کھال اُس کی کھینچنا
اپنے کو جانتا ہے اگر موشگافِ دِل

ہوتے ہیں آپ متفق الرائے یا نہیں
کرتا ہے یہ سمجھ کے کبھی اختلافِ دِل

گفتار اُس کی ہوتی ہے خود بے حروف و صوت
سمجھے گا کون لاکھ کرے انکشافِ دِل

کرتے نہیں وہ بات کبھی پیچ لپیٹ کی
اُن کی زباں بھی صاف ہے جن کا ہے صاف دل

حادؔی تمہاری زبانِ غزل تو سلیس ہے
لیکن کدورتوں سے ہے کیا پاک صاف دِل

ردیف [م]



چل نہیں سکتا جہاں قوت سے کام
لوگ لیتے ہیں وہاں حکمت سے کام

رک نہیں سکتا کسی صورت سے کام
صاحبِ ہمت جو لے ہمت سے کام

ان کے پورے ہوتے ہیں قدرت سے کام
لیتے ہیں جو آپ کی نسبت سے کام

بے ارادہ بھی کسی پر کیوں پڑے
جب نظر کو ہے تری صورت سے کام

جانتے ہیں قدرِ آسائش وہی
کرتے ہیں دنیا میں جو محنت سے کام

خدمتِ خالق ہو یا مخلوق ہو
تو جو خادم ہے تو رکھ خدمت سے کام

فطرۃً ہے بندگانِ عشق کو
عاجزی سے واسطہ منت سے کام

آپ کو فرصت کبھی ملتی نہیں
آپ کر سکتے بھی ہیں فرصت سے کام

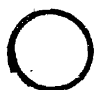
اُن کی بیداری بھی عینِ خواب ہے
جو ہمیشہ رکھتے ہیں غفلت سے کام

غم کا سرمایہ اللہُ غنی
جس کو ہو لے اسی دولت سے کام

چاہتا ہے وہ کہاں نام و نمود
آپ کے حاوی کو کیا شہرت سے کام



اللہ اللہ فکرِ مومن کی رسائی کیا کہوں !
طائرِ بے پر ہے لیکن عرش تک پرواز ہے



تیرے در پر دل کی مجبوری سے تھے شب باش ہم
دیکھنے والوں نے یہ سمجھا کہ ہیں اوباش ہم

کر کے دنیا پر بھروسہ بے بھروسہ ہو گئے
کام کچھ تو عاقبت بینی سے لیتے کاش ہم

انقلابِ دہر کیا ہے گردشِ تقدیر کیا
پا رہے ہیں اپنے ہی کرتوت کی پاداش ہم

ہے سفر درپیش لیکن کچھ نہیں زادِ سفر
عمر کا سرمایہ کھو کر ہو گئے قلاش ہم

اپنی حالت کا اگر پردہ نہ ہوتا رکھ رکھاؤ
یوں نظر آتے نہیں ہشاش بشاش ہم

دوسروں پر بوجھ بننے میں ہے خودداری کی موت
اپنے کندھوں پر لیے پھرتے ہیں اپنی لاش ہم

کیوں چھپانے کی توقع دوسروں سے ہے بھلا
راز اپنا کر چکے حاوی جہاں خود فاش ہم

ردیف (ں)



دردِ دل ہے تری تمنّا میں
کیوں نہ راحت ملے اس ایذا میں

غرق ہیں جو خیالِ دُنیا میں
کیوں نہ پیاسے رہیں وہ دریا میں

جی رہے ہیں تری تمنا میں
اور ہم کیا کریں گے دُنیا میں

اب تو احباب بھی ہیں اعدا میں
کیا ہوا چل رہی ہے دنیا میں

تجھ کو دل دے کے چاہنے کے لئے
اک ہماری کمی تھی دُنیا میں

کس طرح ہو علاج وحشت کا
گھر میں صحرا نہ گھر ہے صحرا میں

قید معشوق کو کیا اپنے
عیب یہ رہ گیا زلیخا میں

مجھ کو دیکھا تو شوخیاں سوجھیں
پڑ گئی گدگدی سی اعضا میں

مرنے والے تری اداؤں پہ
جیتے ہیں وہ تری ہی دنیا میں

آپ کا غیر سے بگڑنا کیا
ہے تلوّن مزاجِ والا میں

کیفیت سے نہ رہ سکی خالی
شوخئ رنگِ بادہ مینا میں

کوئی پوچھے تو آج حاوی سے
کیا کیا تم نے رہ کے دنیا میں



تمہارے غم کو جو کھا کھا کے پرورش پائے
غمِ زمانہ اُسے کھائے گا تو کیا ہو گا

حضرتِ دل کا حشر کیا ہوگا
دین میں سُرخ رو نہ دنیا میں

اب تمنّا نہیں رہی کوئی
جب سے ہے آپ کی تمنّا میں

عشق دل میں چھپاتے ہیں دشمن
یعنے گڑ پھوڑتے ہیں کُلیا میں

خطِ پیشانی کیا پڑھوں حاویؔ
یہ خدا جانے ہے کس اِنشا میں



دو شعر

تُلا ہوا ہے زمانہ جسے مٹانے پر
وہی زمانے پہ چھا جائے گا تو کیا ہوگا

سوال کرنے کی جرأت کبھی ہو جو سائل میں
تمہارے سامنے گھبرائے گا تو کیا ہوگا



لوگ جب تیرے مست کو بھتا میں
پھر مزہ کیا ہے لغزشِ پا میں

حسرتِ دید قیس کب نکلی
کچھ نظر آ گیا تھا لیلا میں

حضرت شیخ بس قصور معاف
ہوں گے دُنیا کے کام دُنیا میں

کیفیت چشم مست ساقی کی
کیا ملے مے کشوں کو صہبا میں

کوئی نعمت نہیں جو سچ پوچھو
اِن حسینوں سے بڑھ کے دنیا میں

غیر سے آپ ہی نبٹ لیجئے
ہیں! پھر اس اختلافِ بیجا میں

قیس کیا قیس کی محبت کیا

دُعا زباں پہ مگر نقص ہے یہ سائل میں
نہیں یقینِ اجابت غریب کے دل میں

بدل گئی وہ بتدریج شوخیوں میں تری
جو تھی متانت و سنجیدگی اوائل میں

یہی ٹھکانہ ہے طوفان کے ٹھہرنے کا
اماں جو چاہنے والا پناہِ ساحل میں

قدم قدم پہ ہے کیسی نئی نئی افتاد
مجاہدے ہیں کٹھن زندگی کی منزل میں

یہاں اسی کے قدم چومتی ہے آسانی
جو بدحواس نہ ہو انتہائے مشکل میں

نہیں ہے صاحبِ محفل کے دل میں کوئی مقام
جگہ تو پانے کو ہم پا چکے ہیں محفل میں

تری ادا کے سوا اس کا نام کیا ہوگا
جچے نگاہ میں کُھب جائے جو مرے دل میں

کمی نہیں ہے زمانے میں ایسے لوگوں کی
جو خود کو حق پہ سمجھتے ہیں زعمِ باطل میں

بدل گیا بہت اسلوبِ شاعری حادی
شمار فنِ سخن کا ہے مدِ فاضل میں



اس کو بھولو نہ عیش و عشرت میں
یاد آتا ہے جو مصیبت میں

یہ مرے دل سے تو نکل نہ سکی
لاکھ صدمے سہی محبّت میں

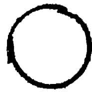
عقل معذور ہے تو دل مجبور
کچھ نہیں سوجھتا محبّت میں

خلق کا کارساز خالق ہے
دخل بندے کا کیا ہے قدرت میں

جا چکے جو جہانِ فانی سے
چین سے سو رہے ہیں تربت میں

شیخ تکتے ہیں کیوں حسینوں کو
کیا فتور آ گیا ہے نیت میں؟

ہر مرض کا جو آ جبر ملتا ہے
کیا یہ رحمت نہیں ہے زحمت میں؟



ہے وہ آئینہ رو مقابل میں
لوگ حیرت زدہ ہیں محفل میں

مجھ کو اِلزام دے نہ محفل میں
چور دل کا رہے ترے دل میں

چُپ نہیں میرے آگے ذکرِ عدو
چور کوئی ضرور ہے دل میں

کام حُسنِ طلب سے لے تم سے
یہ ہنر ہی نہیں ہے سائل میں

ہے محبت میں شیخ جی کو کلام
یہ نہیں آپ کے مسائل میں





ان کے قد کی کیا شباہت سرو میں شمشاد میں
فرق ہوتا ہے بڑا پابند میں آزاد میں
نت نئی رنگینیاں ہیں حسنِ آدم زاد میں
صاحبِ ایجاد ہے یہ عالمِ ایجاد میں
سوز و رقت دل ہی میں یا اتحادِ اضداد میں
ورنہ پتھر میں ہے پانی آگ ہے فولاد میں
غم زیادہ سے زیادہ دینے والے ہیں نثار
کر ذرا تو سعی بھی تو عمر کی میعاد میں
وہ ستم ڈھائے ہیں تم نے بس خدا یاد آ گیا
ہم اسی کو بھول بیٹھے تھے تمہاری یاد میں
ان کے جملے تیر و نشتر لوں کبھی ہوتے نہ تھے
کچھ نہ کچھ دل کی خلش ہے بحث کی بنیاد میں
آ گیا تحریر میں جو آپ کا حسنِ سلوک
بن گیا حسنِ عبارت وہ مری روداد میں
میں سمجھتا ہوں عدم کا ترجمہ ہے نیستی
لوگ کس ہستی کے قائل ہیں عدم آباد میں
اے نہالِ آرزو ہم تجھ سے کیا ہوں گے نہال
پھولنا پھلنا نہ ہو جب تیری جڑ بنیاد میں

بارگاہِ عشق سے حاوی ہوا کیا سرفراز؟
داغ اگر دل کے نہیں ہیں معتبر اسناد میں



کہیں بھی اتنی گنجائش نہیں ہے دو جہانوں میں
دلِ مومن کی وسعت پر ہے حیرت آسمانوں میں

ہے ایسی بات صرف اللہ والوں کی زبانوں میں
اُتر جاتی ہے دل میں جب وہ پڑ جاتی ہے کانوں میں

دلوں میں شوقِ نظارہ ہے یہ کیسی نوازش ہے
نہیں ہے تابِ نظارہ مگر جب ہم ناتوانوں میں

بھلا یہ قائلِ حدِ نظر کیا جان سکتے ہیں؟
جو علویات کا عالم ہے پنہاں آسمانوں میں

دلائل سے کبھی عرفاں کی گتھی نہیں سلجھی
اُلجھ کر رہ گئے سب فلسفی اپنے بیانوں میں

تعجب ہے ہر اک کو نفس کیوں محبوب ہے اتنا
یہ سب کا دشمنِ جانی ہے سب اس کے مہربانوں میں

یہاں تکمیل اقرارِ ازل کی کون کرتا ہے
دلوں میں استقامت ہے نہ پابندی زبانوں میں



جو گزرے عمر یوں ہی بے حسی میں
تو پھر کیا فرق موت و زندگی میں

سلیقہ دشمنی کا دوستی میں
نہیں دیکھا سوا تیرے کسی میں

نہ تھے دنیا کی پُرکاری سے واقف
اٹھائی ہم نے زحمت سادگی میں

نہیں اس پر کوئی حدِ شریعت
خطا سرزد ہو جو وارفتگی میں

محبت زندگی سے کرنے والو!
مزا کیا تم نے پایا زندگی میں

کوئی گم ہے ترے جلوے میں لیکن
نظر آتی ہے ہر شئے روشنی میں

کہوں کیا سرکشیٔ نفس ہادی
یہ کتنا شیر ہے اپنی گلی میں

وہی ہر اک قدم پر امتحاں لیتے ہیں بندوں کا
اُنھیں کے فضل پر ہے کامیابی امتحانوں میں

اسی کے جاننے پر منحصر عرفان ہے رب کا
حقیقت نفس کی وہ چیستاں ہے چیستانوں میں

مساوی کر دیا ادراکِ قربِ ذات نے سب کو
نہ پستی ہے زمینوں میں نہ رفعت آسمانوں میں

کہا جاتا ہے گونگا عارفوں کو اس لیے حاوی
کہ قلت ہے بڑی کثرت سے ان کے ہم زبانوں میں



دو شعر

عاشق ہوا ہوں اب تو دلِ داغ دار کا
یہ ایک پھول رہ گیا اپنی بہار کا
کچھ حوصلہ تو نکلے دلِ بے قرار کا
دارد ایک بار کا نہ سہی لاکھ بار کا

کیف وہ کیف ہے محبّت میں
جو ادا ہی نہ ہو عبارت میں

کس کو دیکھا ہے تیری صورت میں
آئینہ روبرو ہے حیرت میں

حُسن کی شان ہے متانت میں
لاکھ شوخی رہے طبیعت میں

صبر کو جب کبھی تو کہتے ہیں
کر ادا شکر ہر مصیبت میں

حُسن پہ چُپ نہیں کوئی مائل
ہے مصوّر کی شان صورت میں

گو مدارِ عمل ہے نیت پر
لیکن اخلاص بھی ہو نیت میں

سر اٹھاتے ہیں خاک کے پُتلے
آگ ہے شاید اِن کی طینت میں

عقل معذور ہے تو دل مجبور
کون مختار ہے محبت میں

اِس پُر آشوب دَور میں حادی
اپنا جینا بھی ہے کرامت میں



انسان بے ثبات سہی کائنات میں
ہے ساری کائنات اسی بے ثبات میں

آتا ہے لب پہ ذکر ترا بات بات میں
جمتی نہیں کسی پہ نظر کائنات میں

آسائشوں کو ڈھونڈنے والو حیات میں
ملتے ہیں زندگی کے بڑے حادثات میں

مجھ پر کبھی اک نظر غلط انداز ہی سہی
محسوب کچھ نہ کچھ تو رہے التفات میں

میں تیری کائنات سے کیوں بہرہ ور نہیں
میرا شمار بھی ہے اگر کائنات میں

وقتِ سحر کلی کا تبسم ہی دیکھئے
دیکھا نہیں جو گریۂ شبنم کو رات میں

غائر نظر سے دیکھ تقاضائے وقت کو
نباضِ وقت بن کے ذرا کائنات میں

نظروں میں کیف، دل میں سرور، آنکھ میں خمار
دیدار بھی کسی کا ہے کیا مسکرات میں

مخلوط ہو گئے بن گئی تعلیم خود حسین
ملتا ہے درسِ عشق بھی اب جامعات میں

ہے بے وفا حیات تو ہو نے دو غم نہیں
لفظِ وفا شریک ہے میری وفات میں

فکرِ سخن میں آپ اچانک جو آگئے
حادی روی کو بھول گیا انبساط میں



دو شعر

دل اپنی دھن میں ہے تو جگر اپنی دھن میں ہے
اک بے قرار دوست نہیں بے قرار کا

دشمن کہاں سے لائے محبت بھری نگاہ
ٹھہرا تری نظر میں مگر اعتبار کا

اپنے اعمال سے تو آس نہیں
مگر اُن کے کرم سے یاس نہیں

آپ کا قُرب کیا معیّت کیا
کہیں گنجائشِ قیاس نہیں

درمیانِ امید و بیم ہیں سب
کوئی بے خوف و بے ہراس نہیں

مُضغۂ گوشت کے سوا کیا ہے
دل جو پہلو میں حق شناس نہیں

سب کو دُنیا سے آس ہے لیکن
چیل کے گھونسلے میں ماس نہیں

بندہ بے نیاز ہوں ایسا
اب کسی سے کچھ التماس نہیں

ہے یہ انسان عالمِ اصغر
کون سی چیز اس کے پاس نہیں

حمد کے ساتھ لام استغراق
غیرِ حق لائقِ سپاس نہیں

کون ہے ماورائے معقولات
جس کے جاسوس یہ حواس نہیں

ہے گنہ سے ہراس یاس نہیں
رحمتِ حق سے کس کو آس نہیں

مختلف کیوں ہے رنگِ شب و شباب
اپنی ہستی اگر لباس نہیں

سخت مشکل ہے نفس کی تہذیب
یہ کوئی زینتِ لباس نہیں

مومنوں کا شعار ہے تقویٰ
اس سے بہتر کوئی لباس نہیں

"سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ"
قلبِ مومن محلِّ یاس نہیں

دلِ بے مدعا ہے وہ عنقا
جس سے اب کوئی روشناس نہیں

شرفِ قربِ حق زہے قسمت
بے ادب ہوں ادب شناس نہیں

اس کا سودا کسی کو راس نہیں
آس دنیا سے غیر یاس نہیں

حاوی اپنا کلام رندانہ
خمریاتِ ابو نواس نہیں

لہ ، کثرتِ بت

زندگی پر اپنی پیار آتا نہیں
جان کی پروانے کو پروا نہیں

دل نے کیا کیا مجھ کو سمجھایا نہیں
سوچتا ہوں، میں نے سمجھا یا نہیں؟

دردمندِ عشق ہیں خوددار بھی
کب تڑپتے ہیں پتہ چلتا نہیں

سرفروشوں کا ہے اُونچا مرتبہ
حوصلہ مندوں کا سر جھکتا نہیں

آبیاری خون سے جب تک نہ ہو
نخلِ ملت پھولتا پھلتا نہیں

واہ کیا روشن زمانہ ہے ترا
تیرہ قسمت روشنی پاتا نہیں

عشق نے ٹکسال باہر کر دیا
سکۂ عقل و خرد چلتا نہیں

تجھ کو بڑھنا ہے قدم آگے بڑھا
رُکنے والے پاؤں میں کانٹا نہیں

کیوں زمانے کی خوشامد اس قدر
یہ تری مرضی پہ تو چلتا نہیں

غم کا وارث ہیں اگر تنہا نہیں
پھر کوئی حق دار کیوں آیا نہیں

موت کی آغوش میں ہے زندگی
مرنے والو اب کوئی کھٹکا نہیں

وہ مُسافر ہوں میں اپنے شہر میں
جس کا کوئی پوچھنے والا نہیں

واہ اے پروردگارِ آرزو!
آرزو کیا ہے یہ پہچانا نہیں

زخم دل کے ہو گئے پھر کیوں ہرے
آنکھ سے پانی یہاں برسا نہیں

ایک جب تک ظاہر و باطن نہ ہو
آدمی اچھا نہیں سچّا نہیں

خونِ دل! یہ کیف و لذت اور تُو؟
مئے نہیں، بادہ نہیں، صہبا نہیں

آفتابِ زندگی تو سر پہ ہے
چھاؤں کیسی؟ خود مرا سایا نہیں

کچھ دروغِ مصلحت آمیز ہے
شعر حاوی کا نرا جھوٹا نہیں

قفس قفس ہے تو کیا نقص بال و پر میں نہیں
اسیر ہوں بھی تو صیّاد کے اثر میں نہیں

ہیں قائل ایسے جگر کا ہوں جس میں درد رہے
وہ ایسے درد کے قائل ہیں جو جگر میں نہیں

خود اپنے دیکھنے والوں سے پوچھئے کیا ہے
شرارت آنکھ میں خوشی اگر نظر میں نہیں

خبر بھی ہے. مجھے نفرت سے دیکھنے والے
میں چاہتا ہوں جسے وہ تری نظر میں نہیں

نہ کیجے فکر کبھی انتقام لینے کی
خطا معاف یہ الجھن ہی درگزر میں نہیں

کوئی مقام نہیں آپ کے بغیر مرا
میں اپنے گھر میں ہوں یوں جیسے کوئی گھر میں نہیں

یہ تیرا غیظ بھی کیا حسنِ غیظ ہوتا ہے
کہ جس غضب کے بل ابروپہ ہیں کمر میں نہیں

کٹی جو رات تو شمعِ حیات گُل نہ ہوئی
الٰہی ایسی ہوا کیا دمِ سحر میں نہیں

تو جبہہ سائی پہ نازاں تو ہے مگر حاوی
علامت ایسی کوئی اُن کے سنگِ در میں نہیں

ترکِ آرائش بھی سو آرائشوں سے کم نہیں
زلفِ برہم پر تصدق آپ تو برہم نہیں

اور کیا نکلا سوا اِس کے مآلِ ضبطِ غم
سب مری نسبت سمجھتے ہیں "اِسے کچھ غم نہیں"

مانتا ہوں میں نظر اُن کی غلط انداز تھی
ہو خوشی جس سے زیادہ وہ عنایت کم نہیں

واہ وا یہ ذوقِ بے تابی یہ لطفِ اضطراب
غم ترا عیش دو عالم سے سوا ہے کم نہیں

چاہنے والوں کو ملتی ہے حیاتِ جاوداں
تم پہ جو مرتے ہیں اُن کی جان کا جوکھم نہیں

مجھ کو ناکامی میں بھی ہے کامیابی کا سرور
تو اگر خوش ہے کہوں کس منہ سے میں خرم نہیں

ہیرا ہیرا اشکِ ندامت ہے اساسِ مغفرت
دھوپ سے یہ اُڑنے والا قطرۂ شبنم نہیں

زخمِ دل پانی چُرانا تو نہیں اے چارہ گر!
عالمِ رقت میں کیوں آنکھیں ہماری نم نہیں

دل کے ہر گوشے میں حادی روز و شب ہے روشنی
کیا یہ داغِ عشق رشکِ نیرِ اعظم نہیں

محبت ہنسی، کھیل، ٹھٹا نہیں
عدو کا یہ دل، یہ کلیجا نہیں

مجھے خود پتہ اس کا چلتا نہیں
میرے دل میں کیا کیا ہے کیا کیا نہیں

جسے دیکھو ہے ایک بھروپ میں
یہ دُنیا تماشا ہے دُنیا نہیں

حجاب اس سے ملنے میں کیوں آپ کو
کسی بات کا جس سے پردا نہیں

محبت نہیں تو عداوت سہی
مگر وہ کسی میں بھی پورا نہیں

تری بے نیازی کے قُربان ہوں
مجھے اب تو اپنی بھی پروا نہیں

ٹپکتی ہے چتون سے ایک ایک بات
وہ خاموش ایسے ہیں گویا نہیں

ہے واعظ کے افعال پر اعتراض
یہ اقوال جو کچھ ہیں بے جا نہیں

فریب نظر کے ہیں سارے شکار
یہ دھوکہ کی ٹٹی ہے دنیا نہیں

مرے صلح کل دل میں سب ایک ہیں
یہاں کوئی اپنا پرایا نہیں

ہر اک عیش و راحت میں دیتا ہے ساتھ
مصیبت میں کوئی کسی کا نہیں

نظر بھی تو ہے آنکھ سے دُور دُور
کسی کا کوئی ساتھ دیتا نہیں

بصیرت بصارت سے حاصل ہو کیا
یہاں آنکھ والے بھی بینا نہیں

عدو بھی ہے عاشق مگر ہم نشیں
وہ جتنا سمجھتے ہیں اتنا نہیں

مرا خانۂ دل ہے یوں بے چراغ
کہ جیسا کوئی رہنے والا نہیں

نظر ہو جو اُونچی تو کیا دیکھیے
نگاہوں میں کوئی سماتا نہیں

میرے دوست حادی سمجھتے ہیں یہ
جو شاعر نہیں ہے وہ جھوٹا نہیں





کوئی پُرسانِ حال ہے کہ نہیں
زندگی تو بحال ہے کہ نہیں

غم خوشی کا مآل ہے کہ نہیں
چھوڑنے کی مجال ہے کہ نہیں

درد سے دل نہال ہے کہ نہیں
یہ مرے حسبِ حال ہے کہ نہیں

وہ نگاہیں جھکائے چلتے ہیں
دل میں بھی انفعال ہے کہ نہیں

ٹھوکریں کھانے والے دیکھ تو لے
راستہ پائمال ہے کہ نہیں

نہیں کوئی تری مثال تو کیا
تو خود اپنی مثال ہے کہ نہیں

جی رہے ہیں جو سوگوارِ حیات
اُن کا جینا کمال ہے کہ نہیں

اُن سے باتوں کا نام تو ہے غزل
شاعری بول چال ہے کہ نہیں

کون رفتارِ دہر سے پوچھے
یہ قیامت کی چال ہے کہ نہیں

میری نظروں کو تاڑنے والے
ہر نظر اک سوال ہے کہ نہیں

جنسِ حکمت جہاں ملے حاوی
تیرا گم گشتہ مال ہے کہ نہیں



ستم ظریف نے دُہرا دیئے مرے الفاظ
مرا سوال ہی گویا مرا جواب ہوا



پستی پہ اپنی آج خود اپنی نظر نہیں
پہنچے ہیں کس مقام پہ یہ بھی خبر نہیں

اے دل یہ زہد خشک ترا معتبر نہیں
دیکھ اُس کی آڑ میں کہیں دامن تو تر نہیں

کوئی بسا ہوا ہے تصور میں رات دن
میں اُس کو دیکھتا ہوں جو پیشِ نظر نہیں

کیا کوئی حدِّ وسعتِ دل کو بتا سکے
اطراف اُس مکان کے دیوار و در نہیں

وہ بھی تو فاقہ مست ہیں جو مستِ ناز تھے
پھر لطف یہ کسی کو کسی کی خبر نہیں

دنیا جمیل کہتی ہے سرکار کو مگر
اک میں ہی کیا کسی کی نظر بہرہ ور نہیں

اس کا ہر ایک لفظ ہے تاریخِ انقلاب
رودادِ مختصر بھی مری مختصر نہیں

رویت میں ہو حقیقتِ اشیا بھی منکشف
ہر شئے کو دیکھنا ہے کمالِ نظر نہیں

گرویدۂ مجاز ہے صورت پرست ہے
حاوی نگاہ تیری حقیقت نگر نہیں

شوخیٔ تحریر تو ہے شوخیٔ تقریر نہیں
تیری تصویر بھی گویا تری تصویر نہیں

کام دونوں کے بہ یک چشم زدن کرتی ہے
گو نظر آپ کی تلوار نہیں تیر نہیں

رنگِ محفل سے ترے دنگ ہیں اہلِ محفل
کوئی ایسا بھی ہے جو صورتِ تصویر نہیں

انتظار آپ کا دیتا ہے تڑپنے کے مزے
کیجیے تاخیر مجھے شکوۂ تاخیر نہیں

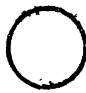
کیوں مجھے خواب کی تعبیر کا آتا ہے خیال
خواب کیا میرے خیالات کی تعبیر نہیں

یوں بھی نادم ہوں خطا مجھ سے کوئی ہو کہ نہ ہو
آپ کے آگے ڈھٹائی ہے نہیں تقصیر نہیں

جذب ہو سکتے نہیں آپ کے دامن میں کبھی
ایسے آنسو جو مرے درد کی تفسیر نہیں

دست بستہ ہے ترے آگے اسیرِ اُلفت
یہ وہ قیدی ہے جسے حاجتِ زنجیر نہیں

دل کو تصویر سے بہلانے کی صورت کیا ہے
پاس حاوی کے اگر صاحبِ تصویر نہیں



لیا ہے دل کو تو لوٹانے کا خیال نہیں
پرائے مال پہ کیا ان کے دیدے لال نہیں

اگر طلب مری شرمندۂ سوال نہیں
حضور سے بھی تو پوشیدہ میرا حال نہیں

مجھے اب اس کے سوا اور کچھ ملال نہیں
خیال میں ہوں میں جس کے وہ ہم خیال نہیں

زمانے والوں کو ہے کیوں زوال کا شکوہ
کوئی عروج زمانے کا بے زوال کا نہیں

وہ لاکھ چاہنے والے کو بے وفا سمجھیں
مگر زمانے میں ایسی کوئی مثال نہیں

نئی ہے جس سے سنو داستاں محبت کی
یہ پائے مال حکایت بھی پائے مال نہیں

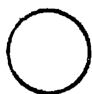
تجھی کو دیکھ رہا ہوں ہر ایک صورت میں
یہ واقعہ ہے کوئی خواب یا خیال نہیں

کسی کے ساتھ جو گزرا گزر گیا لیکن
اُس ایک دن کے برابر ہزار سال نہیں

وہ کون ہے جو نہیں تیرے گیسوؤں کا اسیر
وہ کون ہے جو گنہ گار بال بال نہیں

سوال کرنے کی صورت بتا مرے داتا!
ترے فقیر کی صورت اگر سوال نہیں

تغزّل اور ترنّم ہے اور اے حاوی
یہ رنگِ لحن ہے رنگینیِ خیال نہیں



نگاہ اُٹھ نہ سکی اس کے روئے روشن پر
مرا حجاب ہی میرے لیے حجاب ہوا



قسمت کا پاسباں بنا ہوں
یہ سوتی ہے میں جاگتا ہوں

آئینۂ ذاتِ کبریا ہوں
بندہ ہوں مگر خدا نما ہوں

تکلیفِ خرد اُٹھا چکا ہوں
اب قدرِ جنوں کی کر رہا ہوں

معراجِ نظر ہے اُن کا جلوہ
میں تابِ نظر کو دیکھتا ہوں

ہوتا ہے وہی جو آپ چاہیں
وہ بھی ہو جائے میں جو چاہا ہوں

دنیا مرے حق میں دوسری ہے
یا اس کے لیے میں دوسرا ہوں

اُٹھے نہ قدم تری گلی سے
دنیا سے ہاتھ اُٹھا چکا ہوں

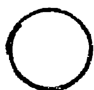
میلانِ نگاہ اُن کی جانب
اتنے سے جھکاؤ پہ گرا ہوں

قدموں سے اُٹھائے نہ اپنے
گرنا تھا جہاں وہیں گرا ہوں

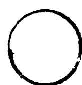
جلوے سے ہوں اُس کے غرقِ حیرت
خشکی پہ قدم ہیں ڈوبتا ہوں

واجب تھی یا کوئی نقشِ پا پہ
اب سجدۂ سہو کر رہا ہوں

میں اُن کو سلام کرکے حادی
عنوانِ کلام سوچتا ہوں



مخاطِب اُن کا جو رہتا تھا رات دن حادی
وہ آج کس لیے ناقابلِ خطاب ہوا



میں تجھ کو دیکھ کر ترے رُخ پر نثار ہوں
یا آپ ہی خود اپنی نظر کا شکار ہوں

پوشیدہ تیری ذات ہے میں آشکار ہوں
پردے کی بات یہ ہے ترا پردہ دار ہوں

واقف نہ تھا فریبِ سفید و سیاہ سے
منّت پذیرِ گردشِ لیل و نہار ہوں

تیری کوئی نظیر نہ میرا کوئی جواب
غفلت شعار تو ہے. میں اُلفت شعار ہوں

میرا ارادہ شرط ہے ہر کام کے لیے
بے اختیار ہوں بھی تو با اختیار ہوں

رنگینیٔ خیال ہے وجہِ شگفتگی
اپنی جگہ میں خالقِ فصلِ بہار ہوں

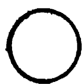
بچتا ہوں اپنے ناصحِ مشفق سے رات دن
میں بھی اِس اعتبار سے پرہیزگار ہوں

ارمان دل کے دل ہی میں سب دفن ہو چکے
گویا میں چلتا پھرتا ہوا اک مزار ہوں

میری طرف بھی ایک نگاہِ جنوں نواز
تو ہیں بے خودی ہے جو میں ہوشیار ہوں

ذاتی مرا انا ہے نہ ذاتی مرا وجود
کس کا ہے یہ زباں پہ مری برقرار "ہوں"!

رودادِ زندگی تجھے حاوی سناؤں کیا
ستر برس سے سینۂ گیتی پہ بار ہوں



ایک شعر

خدا ہی جانے حسن و عشق کی برعکس باتوں کو
کسی نے آئینہ دیکھا کوئی کمبخت حیراں ہے



اُن کا بھی خیال کر رہا ہوں
دل کی بھی سنبھال کر رہا ہوں

گزرے ہوئے غم ہوئے ہیں تازہ
ماضی کو حال کر رہا ہوں

ممکن ہے غلط ہو تیرے نزدیک
جو کچھ میں خیال کر رہا ہوں

دل اپنی جگہ سے برطرف ہے
میں کس کو بحال کر رہا ہوں

اس طرح وہ ٹالتے ہیں مجھ کو
گویا میں سوال کر رہا ہوں

کیوں اس غمِ عشق نے نہ مارا
جیتا ہوں کمال کر رہا ہوں

اے وسعتِ دل ترے تصدق
دُنیا کے خیال کر رہا ہوں

دانستہ تری بات اگر کاٹ رہا ہوں
تکرار کی لذت میں زباں چاٹ رہا ہوں

تلوار کی اک دھار سہی وقت کا دھارا
جیسے بھی کٹے عمر کے دن کاٹ رہا ہوں

دنیا کے کسی ٹھاٹ کا کیا ٹھاٹ ٹھکانہ
ٹھہرا جو سبک بار تو بے ٹھاٹ رہا ہوں

کچھ کم نہیں طوفانوں سے جذبات کا ہیجان
کیا میں بھی سمندر کا کوئی پاٹ رہا ہوں

اللہ رے یہ کیف، یہ مستی، یہ حلاوت
لے لے کے ترا نام زباں چاٹ رہا ہوں

کیوں مجھ سے وہاں راہ نما کٹ گئے دل میں
منہ پھیر کے رستے کو جہاں کاٹ رہا ہوں

افکار ہیں آزاد تو گفتار مقیّد
اس قید کی چپ چاپ سزا کاٹ رہا ہوں

ہے زیست کی راہوں میں جو پستی و بلندی
ہموار نہیں ہوتی مگر پاٹ رہا ہوں

حادی کبھی بر آئی ترے دل کی تمنا
میں نخلِ تمنا کی جڑیں کاٹ کر رہا ہوں

زندگی کا سوانگ بھرتا ہوں
کوئی کیا جانے کس پہ مرتا ہوں

خوف کیا انقلاب کا مجھکو
اپنی کم زوریوں سے ڈرتا ہوں

اس کو میرا ہی اعتبار نہیں
جس کا میں اعتبار کرتا ہوں

جان لی کس نے؟ ہائے پاسِ ادب
میں اجل ہی کو نام دھرتا ہوں

قول سے اپنے آپ پھرتے ہیں
یا زباں دے کے میں مکرتا ہوں

ہے خرد میں کہاں یہ ذوقِ حیات
اپنی وارفتگی پہ مرتا ہوں

میرا دم خم بھی زورِ طوفاں دیکھ!
ڈوبنے کی جگہ اُبھرتا ہوں

چپ نہیں دیکھتا ہوں سوئے فلک
آنکھ سے ہائے ہائے کرتا ہوں

ہے پس و پیش موت کو حاوی
جیتے جی میں جو اُن پہ مرتا ہوں



زمانے بھر کے ستم سہہ کے مسکراتے ہیں
یہ اُن کا ظرف ہے جو تیرے غم کو کھاتے ہیں

قرابت اپنی رگِ جاں سے وہ بتاتے ہیں
یہ کیسے رشتے ہیں کیا جانے کیسے ناتے ہیں

زمانے کی کبھی کرتے ہیں آزمائش ہم
زمانے والے کبھی ہم کو آزماتے ہیں

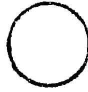
اُنھیں سے پوچھئے صورت پرستی منع ہے کیوں
جو صورتوں ہی سے ذوقِ شہود پاتے ہیں

نظامِ آب و گِل اتنا فریبِ دیدہ و دل
یہ سب حضور کے جلوے ہی رنگ لاتے ہیں

کسی پہ کُھل نہ سکی راہ اُن کے آنے کی
سب آنے والے تو آنکھوں سے دل میں آتے ہیں

رہو تم اپنے ہی مُنعم کے ذِکر میں حاوی
کہ جس کا کھاتے ہیں سب لوگ اسکی گاتے ہیں

ردیف (و)



دردکا اب یہ تقاضہ ہے سراپا دل بنو
جو ہر اک بے درد کو تڑپائے وہ بسمل بنو

یا رہو حق پر اٹل یا پیروِ باطل بنو
بلنے والو اب بنائے جو تمہارا دل بنو

بھول جاتے ہو دُعا میں حفظِ آدابِ دُعا
کیا نہیں ملتا۔ جو سائل کی طرح سائل بنو

تم جو اُس کے بس میں ہو۔ وہ بھی تمہارے بس میں ہے
دل کو جالو رہ نما یا رہ نمائے دل بنو

ہے تو دنیا رہ گزر لیکن کہاں کی رہ گزر
تم اگر ہو راہ رو؟ تو واقفِ منزل بنو

عقل کا یہ مشورہ ہو جاؤ سرتاپا دماغ
عشق کا یہ حکم محکم ہے مجسّم دل بنو

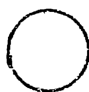
علم وہ کس کام کا جس سے نہ ہو عرفانِ نفس
لاکھ تم قابل بنو، عالم بنو، فاضل بنو

ہو جو خود محتاج کیا دے گا کسی محتاج کو
دینے والے کو ذرا پہچان کر سائل بنو

رُخ نہ پھیرو اپنا سیلابِ حوادث سے کبھی
جس سے ٹکرا کرفنا ہو موج وہ ساحل بنو

ہو چکا پورا فرشتوں کا وہ پہلا اعتراض
تم سے یہ کس نے کہا مفسد بنو قاتل بنو

تم کو جب بننے نہ بننے کا ہے ہادی اختیار
مقصدِ تخلیق سمجھو اور اُس قابل بنو



ایک شعر

میری آنکھوں سے عیاں ہے مرے دل کی حسرت
گھر کا اندازہ کیا جاتا ہے دربانوں سے

خُدائی سے غرض کیا اُس گدا کو
خُدا سے مانگتا ہے جو خُدا کو

مصیبت میں اُسے یاد آ رہا ہے
بُھلایا عیش میں جس نے خُدا کو

جو ظالم ہیں وہ کہلاتے ہیں مظلوم
سزا ملتی ہے ناکردہ خطا کو

یہ داتا کی ہے شانِ سرفرازی
جو بے مانگے بھی دیتا ہے گدا کو

جو مرتا ہے تمہاری اک ادا پہ
وہ کب تکلیف دیتا ہے قضا کو

زبانِ حال تھی میری نگاہیں
سمجھتے کاش وہ بھی مُدعا کو

ہے بالکل آپ کی سی بے نیازی
خُدا رکھے دلِ بے مُدعا کو

میں دنیا ہی سے اُٹھ جاؤں تو شاید
تمہارے ہاتھ اُٹھیں گے دُعا کو

اگر ہے مانگنے کا شوق حادی
رکھو ملحوظ آدابِ دُعا کو



کچھ خفا ہیں وہ بات ہو کہ نہ ہو
کیا خبر التفات ہو کہ نہ ہو

نام تو لے رہے ہیں وہ میرا
کام کی کوئی بات ہو کہ نہ ہو

اُن کی ہر بات میں حلاوت ہے
لبِ شیریں نبات ہو کہ نہ ہو

چاہیئے مجھ کو لذتِ گفتار
اپنے مطلب کی بات ہو کہ نہ ہو

اے مرے چاند اُٹھ نہ پہلو سے
پھر کوئی ایسی رات ہو کہ نہ ہو

اس کی صورت پہ جان دیتا ہوں
موت رشکِ حیات ہو کہ نہ ہو

لبِ مسیحا نفس تو ہیں تیرے
یہ کوئی خاص بات ہو کہ نہ ہو

دوست نے مسکرا کے شہ دی ہے
جان پر کھیل مات ہو کہ نہ ہو

خونِ دل اپنا پی کے جیتا ہوں
اب یہ آبِ حیات ہو کہ نہ ہو

آپ کی ہر صفت کا مظہر ہوں
مستقل میری ذات ہو کہ نہ ہو

آنکھ مستی میں چور ہے اس کی
یہ صفت عینِ ذات ہو کہ نہ ہو

اے مری کائنات کے مالک
تو ہو بس اک کائنات ہو کہ نہ ہو

آپ کو سب جمیل کہتے ہیں
چاہے یہ اسمِ ذات ہو کہ نہ ہو

اس میں حاویؔ زبانِ ہند تو ہیں
دل ترا سومنات ہو کہ نہ ہو



کیا آرزو ہے دل میں اُنھیں بھی خبر نہ ہو
حسرت بھری نگاہ اگر پردہ در نہ ہو

وہ جلوہ کیا نگاہ اگر بہرہ ور نہ ہو
وہ درد کیا تڑپنے میں لذت اگر نہ ہو

پہچان ضد سے ہوتی ہے ہر ایک چیز کی
کیا امتیاز خیر کا ہوگا جو شر نہ ہو

طولِ امل ہے دوسرے معنیٰ میں عاشقی
یارب کسی زمانے میں یہ مختصر نہ ہو

دُنیا ڈرے گی تجھ سے مگر شرط ہے یہی
خود تجھ کو صاف گوئی میں دُنیا کا ڈر نہ ہو

جائز نہیں غلو مگر۔ اک احتمال ہے
معدوم جس کو کہتے ہیں اُن کی کمر نہ ہو

کیا لطف دے گی حسرتِ دیدار کی خلش
ذوقِ نظر کے ساتھ جو ضعفِ نظر نہ ہو

پانی چرا رہا ہے کوئی زخمِ دل ضرور
ورنہ یہ آنکھ عالمِ رقّت میں تر نہ ہو

حاؔوی اُسی کا قافیہ پیمائی نام ہے
جس شاعری میں جدّتِ فکر و نظر نہ ہو

ہے کدھر امن اِدھر اور اُدھر تو دیکھو
پھیلتا ہے جو شرر بن کے وہ شر تو دیکھو

دل کے گوشوں میں اچانک یہ اُچھالا کیسا!
اثر انداز نہیں اُن کی نظر تو دیکھو

پھول ہنستے ہوئے ہو جاتے ہیں پارہ پارہ
نازک اندامول کا یہ دل یہ جگر تو دیکھو

شوق سے میرے معائب کو دکھانے والو
اپنے عیبوں کو چھپانے کا ہنر تو دیکھو

عہدِ ماضی پہ نظر کیوں ہے گزشت آنچہ گزشت
دورِ حاضر کا یہ کہنا ہے اِدھر تو دیکھو

کتنے زخموں کو چھپا رکھا ہے کیا عرض کروں
دوستو وسعتِ دامانِ جگر تو دیکھو

دیکھتے دیکھتے آ پہنچے ہیں کس منزل پر
خستہ حالوں کی پراگندہ نظر تو دیکھو

بڑھ گئی سوزشِ دل جب ہوئی رقت طاری
عین بارش میں یہ جلتا ہوا گھر تو دیکھو

دیکھنے والا تمہارا ہی جو ٹھہرا ہادی
کم سے کم اُس کا یہ معیارِ نظر تو دیکھو

بڑھا دے اور ذوقِ آگہی کو
بہت محسوس کرتا ہوں کمی کو

یہ باہر کیا نظر آئے کسی کو
چراغِ دل ہے گھر کی روشنی کو

تمناؤں میں پھر تری تمنا
بھٹکنے تک نہیں دیتی کسی کو

ملی کچھ ایسی تیرے غم کی لذت
خوشی سے کر دیا رخصت خوشی کو

الٰہی ٹوٹ جائے دستِ گل چین
تمنا چھو لنے کی تھی کلی کو

دلیلِ صبح تاریکی ہے شب کی
اندھیرے ڈھونڈتے ہیں روشنی کو

دکھایا عشق نے بندہ بنا کر
سُنا تھا بندگی بیچارگی کو

یہ کیا کم ہے کہ آنکھیں کھُل گئی ہیں
دُعا دو انقلابِ زندگی کو

وہ ہے صنفِ غزل کی حسن کاری
نکھارا جس نے حاؔدی شاعری کو

ردیف (ہ، ھ)

دن عمر کے تھوڑے ہیں ترے۔ کام زیادہ
آرام نہ لے طالبِ آرام۔ زیادہ

پاتے ہیں زمانے میں وہی نام زیادہ
ہوتے ہیں محبت میں جو ناکام زیادہ

بے کار اگر ہوں بھی تو بےکار نہیں ہوں
لیتا ہوں تصور سے ترے کام زیادہ

مرنے کے لیے ہوتے ہیں آمادہ بہت کم
سب کرتے ہیں جینے کا سرانجام زیادہ

اچھوں سے ہوا کرتی ہے دنیا کو عداوت
رہتے ہیں نکوکار ہی بدنام زیادہ

واقف ہے بہت ظرف سے میخواروں کے ساقی
مقدار سے دیتا نہیں اک جام زیادہ

میں چپ نہیں ساقی تری آنکھوں کا ندیدہ
دیتے ہیں مجھے کیف یہی جام زیادہ

سائے میں تری زُلف کے ہوں رُخ پہ نظر ہے
روشن ہے سحر سے بھی مری شام زیادہ

اب جنسِ وفا آپ کو مشکل سے ملے گی
کم یاب ہے۔ دینا نہ پڑے دام زیادہ

مشہور نہ ہوں کیوں تری بے نام ادائیں
پاتی ہیں یہی نام خدا نام زیادہ

حاوی سے ابھی آپ کے واقف نہیں اکثر
مشہور وہ کم اور ہے گُم نام زیادہ



ایک شعر

دل کی ویرانی پہ ہے وحشتِ مجنوں بھی نثار
کم نہیں اپنے محل پر یہ بیابانوں سے

تیرے بغیر کٹتے ہیں دن بے کسی کے ساتھ
کوئی ہمارے ساتھ نہ ہم ہیں کسی کے ساتھ

کیوں مجھ سے پیش آتے ہو اس بے رُخی کے ساتھ
پڑتی ہے آدمی کو غرض آدمی کے ساتھ

کوئی کسی کے ساتھ ہے کوئی کسی کے ساتھ
ہوتی ہے بے کسوں کی گزر بے کسی کے ساتھ

کیسے ہیں بے نیاز پرستار آپ کے
کیا مل گئی خدائی انھیں بندگی کے ساتھ

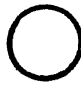
زاہد کا کیوں مقابلہ ہوتا ہے رند سے
جس آدمی کی بات ہے اس آدمی کے ساتھ

ہر شئے کو اُس کی ضد ہی سے پہچانتے ہیں لوگ
ملتے ہیں دوستی کے مزے دشمنی کے ساتھ

ایسے نصیب ہی نہیں۔ ہوتا کہاں نصیب
جینا شکستہ دل کو سلامت روی کے ساتھ

ٹوٹے ہوئے دلوں ہی کو کرتے ہیں وہ پسند
دل بستگی ہے اُن کو شکستہ دلی کے ساتھ

حاوی وہ کیا ملے گا کسی کے کلام میں
مخصوص تھا جو رنگِ تغزل صفی کے ساتھ



خواہش نہ کر سکون کی اب زندگی کے ساتھ
یہ بے طلب ملے گا تجھے موت ہی کے ساتھ

سجدے کا ذوق پائے گا کیا بے خودی کے ساتھ
خود آگہی اگر نہ رہے بندگی کے ساتھ

آجاتے ہیں جو آنکھ میں آنسو ہنسی کے ساتھ
گویا ہے غم بھی دست و گریباں خوشی کے ساتھ

اُن کا شریکِ حُسن ہے خود اُن کے سامنے
کیوں بے خطا ہے آئینہ شرکِ جلی کے ساتھ

ظُلمت نہ ہو تو کون کرے امتیازِ نور
ہر آنکھ میں سیاہی بھی ہے روشنی کے ساتھ

ہاں اے غمِ حیات تماشہ نہ بن کہیں
دُنیا تو کھیلتی ہے ہر اک زندگی کے ساتھ

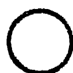
اب تم پہ جان دینے سے باقی نہیں رہی
وہ کشمکش جو موت کو تھی زندگی کے ساتھ

کی اُس نے دشمنی جو بہ عنوانِ دوستی
دشمن فریب دینے لگے دوستی کے ساتھ

ہوتی ہے اُن کے ضبطِ تبسّم سے آشکار
شوخی جو کر گزرتے ہیں سنجیدگی کے ساتھ

ہوت اور شئے ہے حُسن پہ مرنا کچھ اور ہے
وہ زندگی کے بعد ہے یہ زندگی کے ساتھ

حاوی اُسے شریک سمجھنا بھی شرک ہے
غم عینِ زندگی ہے نہیں زندگی کے ساتھ



ایک شعر

پھر گئی آنکھوں میں صورت تری سُن کر آواز!

لذّتِ دید بہ پسِ پردہ ملی کانوں سے

میری جبیں ہے آپ کے نقشِ قدم کے ساتھ
دیر و حرم کی بات ہے دیر و حرم کے ساتھ

یہ سب نمود و نام ہے ان کے کرم کے ساتھ
ورنہ مرا وجود کہاں اس بھرم کے ساتھ

آنسو کا قطرہ آنکھ میں دُرِّ یتیم تھا
دیکھا نہیں کسی نے مگر چشمِ نم کے ساتھ

قاصر ہے ناطقہ تو تکلم کی کیا مجال
وِجدان کو بیان کرے کیف و کم کے ساتھ

جتنی طلب ہو اتنی عطا میں نہیں کمی
ہے اپنا اپنا ظرف یہاں بیش و کم کے ساتھ

منزل ہے دُور اور ہے رہزن بہت قریب
لغزش کا احتمال ہے پھر ہر قدم کے ساتھ

مقصود ہے شہود تو قیدِ مقام کیا
رُخ سوئے دیر بھی ہو طوافِ حرم کے ساتھ

کونین غرق ہے مرے جامِ سفال میں
تشبیہہ کیف و کم ہے غلط جامِ جم کے ساتھ

کیوں فنِ شعر کو نہ ہو حادیؔ یہاں فروغ
مخصوص ہے علوم کی خدمت عجم کے ساتھ



گرویدۂ بہار، مآلِ بہار دیکھ !
کس رنگ میں ہے اب چمنِ روزگار دیکھ

رُخ اپنا پھیر کر مجھے پھر ایک بار دیکھ
اس دیکھنے پہ میری نگاہیں نثار دیکھ

میرا مذاق دیکھ ! غمِ روزگار دیکھ
کس کا جمال ہے کون ہے آئینہ دار دیکھ

تو اس کو دیکھتا ہے وہ ہے محوِ آئینہ
صیاد خیر سے ہے خود اپنا شکار دیکھ

زاہد بھلا یہ تیرے قدم اور میکدہ
سجادہ بن کے بیٹھ کسی کا مزار دیکھ

یہ دعوتِ نظر تو نہیں التفاتِ خاص
وہ خود ہی دیکھتے ہیں اِدھر بار بار دیکھ

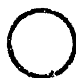
مِل جائے گی حیاتِ ابد عمرِ جاوداں
اُس پہ ہزار جان سے ہو کر نثار دیکھ

مصرف رہے درست خیانت نہ ہو کہیں
ہے زندگی امانتِ پروردگار دیکھ

آنکھوں میں پھر رہی ہے وہی رونقِ چمن
یادِ بہار بن گئی عینِ بہار دیکھ

آنکھیں خدا نے دی ہیں تو پھر دیدہ ور بھی بن
ہوتے ہیں دیکھنے کے کئی اعتبار دیکھ

حاوی رہا جنون و خرد کا مقابلہ
غالب ہے کون معرکہ کارزار دیکھ



ایک شعر

ایسی گفتار کو ہم کہتے ہیں گفتارِ ضمیر
جس کی آواز ہی محسوس نہ ہو کانوں سے

ردیف (ی)

ترے آگے اگر دل سے زباں تک آ نہیں سکتی
مری وہ آرزو، کیا آرزو کہلا نہیں سکتی؟

سیہ بختی اُجالا زندگی میں لا نہیں سکتی
تو کیا اے روشنیٔ طبع تو کام آ نہیں سکتی

حیاتِ جاوداں مطلوب ہے تو جان دے اُن پر
یہ ہے وہ زندگی جس کو اجل بھی پا نہیں سکتی

تری دُھن میں مگن ہوں اب کسی شئے سے غرض کیا ہے
جو دل کو بھا نہیں سکتی وہ دل بہلا نہیں سکتی

تری نظروں کا پھر جانا مری آنکھوں میں پھرتا ہے
طبیعت گردشِ ایام سے گھبرا نہیں سکتی

دمِ رفتار فتنے تیری پابوسی کو اُٹھتے ہیں
قیامت بھی مگر ایسی قیامت ڈھا نہیں سکتی

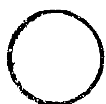
مجھے تعریف کا خوگر بنایا تیری صورت نے
بجا بھی ہو شکایت تو زباں کھلوا نہیں سکتی

یہ مانا اُن کا ہر جلوہ مکرر ہو نہیں سکتا
نظر اہلِ نظر کی بھی تو دھوکا کھا نہیں سکتی

تمنائیں تو بے حد ہیں حدودِ زندگی دیکھو
یہ چادر سے زیادہ پاؤں کو پھیلا نہیں سکتی

زمانہ پھر زمانہ تیرے حسنِ روز افزوں کا
کہ خود تاریخ ایسے دَور کو دُھرا نہیں سکتی

نظارہ دور ہی سے اُن کا ہو جاتا ہے اے حاوی
پہنچتی ہے نظر لیکن وہاں پہنچا نہیں سکتی



دو شعر

ہے دردِ دل کے دم سے ہی سب لطفِ زندگی
بھولے سے اس مرض کا مداوا نہ کیجیے

فردا کو اصطلاح میں کہتے ہیں حشر بھی
لِلّٰہ آپ وعدۂ فردا نہ کیجیے

اس لیے ہوتی ہے ہر دم کی ملاقات بُری
باتوں باتوں میں نکل جاتی ہے اک بات بُری

نہ بُرے تم نہ بُرے ہم نہ ملاقات بُری
کیوں خفا ہوتے ہو ہوتی ہے بُری بات بُری

تم نے دیکھی ہے زمانے کی بُرائی ہم میں
نہ بُرے غیر نہ غیروں کی ملاقات بُری

آپ جو چاہیں کہیں آپ ہیں مجھ سے نہ کہوں
آپ کی بات بھلی اور مری بات بُری

تیری فرقت میں تڑپنے کے مزے خوب ملے
نہ کوئی دن ہی بُرا تھا نہ کوئی رات بُری

آپ کے قاعدہ قانون کوئی کیا سمجھے
نہ بھلی بات بھلی ہے نہ بُری بات بُری

حضرتِ شیخ! بھلا تم کو بُرا کون کہے؟
یہ محبت ہے مگر قبلہ حضرات بُری

آپ خود بات نہ کرتے جو کسی سے حاوی
آج کیوں سنتے کسی کی بھی کوئی بات بُری؟

خبر کیا لیں گے نالے آسماں کی
جو ہو آلودگی شایانِ زباں کی

کہوں کیا خوبیاں اُردو زباں کی
نہیں ہے کوئی بولی اتنی بانکی

مخالف جو ہیں وہ بھی بولتے ہیں
"لطافت دیکھئے اُردو زباں کی"

زمانے کی شکایت اور اُن سے؟
یہ ہے تمہید گویا داستاں کی

یہ رعبِ حسن ہے تیرا محافظ
ادا کرتا ہے خدمت پاسباں کی

قفس سے جب رہائی میں نے پائی
صفائی برق نے کی آشیانہ کی

کبھی ظالم تھا۔ اب حدِ نظر ہے
اسے کہتے ہیں گردش آسماں کی

بہار آئی مگر ایسی نہ آئی
جو قسمت کو بدل دے باغباں کی

شبک ہے اپنی نظروں میں جو حاوی
یہ ہے تعبیر کس خوابِ گراں کی؟

مُشترک جائداد ہے دِل کی
اُن کی مقبوضہ تو مری ملکی

کام کر جاتے نالہ و فریاد
ہے ضرورت وہاں وسائل کی

اُن کے رُخ سے نقاب اُٹھ نہ سکا
رہ گئی لاج ماہِ کامل کی

اس کی خوشنودی چاہتے ہیں سب
تیری خوشنودی جس نے حاصل کی

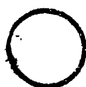
تھی سزاوارِ قیس آہ و فغاں
اب کہاں قدر اِن مشاغل کی

آئے طوفاں سے جو کنارے پر
وہ سُبک ہیں نظریں ساحل کی

حوصلہ مانگنے کا پا نہ سکے
لاکھ صورت بنائی سائل کی

اس میں تنگی بھی ہے فراخی بھی
کچھ عجیب کائنات ہے دِل کی

ضبطِ آنسو نہ ہو سکے حادی
کھوئی آنکھوں نے آبرو دل کی



شبِ فرقت نویدِ جاں فزا پھر اُن کے آنے کی
کہیں لوگوں کو سوجھی تو نہیں ہم کو بنانے کی

نہیں جب موجبِ نفع و ضرر گردش زمانے کی
تو کیا پروا، کرے کوئی بُرائی ہم سے یا نیکی

ہوس ہر بوالہوس کو ہے نمود و نام پانے کی
محبت بھی کہیں ہوتی ہے دنیا کو دکھانے کی!

دلِ ناداں! امید و خوف کیوں دنیا جہاں سے ہے
زمانہ کس کے ہاتھوں میں ہے؟ دے تجھ کو خدا نیکی

بہر صورت نگاہیں اُس کی صورت کو ترستی ہیں
جہاں صورت نہیں ہوتی ہے کوئی منہ دکھانے کی

گماں ہوتا ہے بے شک آنے دل بھی چُرایا ہے
گواہی دے رہی ہے یہ ادا آنکھیں چُرانے کی

نہیں واقف جو شانِ عشق و آدابِ محبت سے
وہ کچھ رسوائیاں ہی مول لیتے ہیں زمانے کی

شکایت کرنے والو! لَا تَسُبُّوا الدَّھرَ کو سمجھو
حقیقت تم کو نا معلوم ہو جائے زمانے کی

محبت ہی میں ہوتی ہے شکایت بھی حکایت بھی
یہاں تو دشمنی بھی ہے علامت دوستانے کی

اگر میں کون ہوں کا سمجھوں تو پھر وہ چھپ نہیں سکتے
ہے اپنے آپ کو پانا ہی حجت اُن کو پانے کی

نہ کوئی کنٹرول اس پر نہ راشن بندیاں حادی
غمِ اُلفت غذا اپنی ہے بے اندازہ کھانے کی



ایک شعر

ناموسِ ضبط پر کہیں پانی ہی پھر نہ جائے
آنسو کے ایک قطرے کو دریا نہ کیجیے



بات دل کی عیاں ہو گئی
آنکھ میری زباں ہو گئی

دل لگی تھی جو دل کی لگی
اب وہی جاں ستاں ہو گئی

وہ مری چپ سے ناراض ہیں
خامشی بھی فغاں ہو گئی

میں تصدق، تری بے رُخی
مستقل داستاں ہو گئی

چپہ چپہ ہے صرفِ ستم
کیا زمیں آسماں ہو گئی!

اب مسلّم ہے میری وفا
فارغ الامتحاں ہو گئی

زندہ رہنے پہ مجبور ہوں
موت خود پاسباں ہو گئی

اوج پہ گردشِ بخت کا
ہم سرِ آسماں ہو گئی

خون ہو کر تمنائے دل
سُرخیٔ داستاں ہو گئی

جان لیوا محبت تری
میری روحِ رواں ہو گئی

دیکھ حاوؔی پہ نامہرباں!
بے کسی مہرباں ہو گئی



ایک شعر

دونوں ہی اختیار سے باہر ہیں آپ کے
موت و حیات کی کبھی پروا نہ کیجئے

کیوں ترے غم کو کھلائے نہ کلیجا کوئی
ایسے مصرف کو سمجھتا نہیں بے جا کوئی

توڑ دل کو مرے یہ کھیل اگر ہے دل چسپ
نہ ملے گا تجھے پھر ایسا کھلونا کوئی

یا مری آنکھ کے پردے ہیں مری حق بیں حجاب
یا تجلی ہی کی صورت میں ہے پردا کوئی

آپ اگر مجھ کو نہ پوچھیں تو نہ پوچھیں لیکن
چارہ سے پوچھیے ہے پوچھنے والا کوئی

آنکھ ملتے ہی نظر ہو گئی نیچی فوراً
یوں دکھاتا تو نہیں ہے مجھے نیچا کوئی

وہ تو سو جان سے ہوتا ہے تصدق اس پر
گو نہیں شمع کو پروانے کی پروا کوئی

بات یہ سچ ہے تری وعدہ خلافی کی قسم
تیرے منہ پہ تجھے کہتا نہیں جھوٹا کوئی

سینک لیں شوق سے اب طالبِ دیدار آنکھیں
عالمِ غیظ میں ہے آگ بگولا کوئی

موت کا فلسفہ آ جائے جو سمجھ میں حاوی
نہ رکھے جینے کی پھر دل میں تمنا کوئی



راہ اُلفت کی رہ روی دل کی
کارواں کی خبر نہ منزل کی

آئینہ کیا کرے گا بیچ بچاؤ
دنگ ہے چوٹ ہے مقابل کی

کیوں اُٹھاتے وہ اپنے رُخ سے نقاب
لاج رکھنی تھی ماہِ کامل کی

اس پہ قسمت بھی ناز کرتی ہے
تیری خوشنودی جس نے حاصل کی

کچھ بتاؤ تو رہ روانِ عدم
کیا ہیں دشواریاں منازل کی

تھی خزاں بھی کبھی بہ رنگ بہار
کیا ہوئی وہ شگفتگی دل کی

پوچھ مجنوں سے ذوقِ آہ و فغاں
اب کہاں قدر ان مشاغل کی

ردیف (ے)

ناخوش گوار وقت کے سانچوں میں ڈھل گئے
دُنیا کو جو بدل نہ سکے خود بدل گئے

جلوے سے ان کے حسن بصر کو تھا واسطہ
قابو سے سب حواس مرے کیوں نکل گئے

اہلِ حسد کو ہم سے حسد کر کے کیا ملا
بے چارے اپنی آگ میں خود آپ جل گئے

دنیا کے اہتمام ہیں دو دن کے واسطے
وہ زندگی ہی کیا ہے جو آج آئے کل گئے

بے دانشی یہ اُن کی ہیں سو دانشیں نثار
جن کے دماغ تیری محبت میں چل گئے

روکے جو پاسبان تصور نے راہ دی
ہم اس کی بزم ناز میں یوں سر کے بل گئے

تھا ان کو امتیاز کہاں نور و نار کا
روشن ہوتی جو شمع تو پروانے جل گئے

اغیار کی نظر میں کھٹکنے کا کیا ملال
ہم اپنے دوستوں کی بھی آنکھوں میں سل گئے

محلوں کے خواب دیکھتے تھے جھونپڑوں میں لوگ
جب جھونپڑے سے کٹے تو خیالی محل گئے

حضرت صفی کے دم سے تھی رنگینیٔ کلام
لطفِ غزل گیا جو امامِ غزل گئے

حادی کو دیکھ پائے جو اپنی جگہ اٹل
پیش آنے والے جتنے حوادث تھے ٹل گئے



دو شعر

جب تک یہ ربط باہمی جسم و جاں رہے
میری جبین اور ترا آستاں رہے
وہ تیری بات سننے پہ مائل جہاں رہے
شکوہ بھی ہو تو شاملِ حسنِ بیاں رہے



مدعا اس کے منہ سے کیا نکلے
تو ہی خود جس کا مدعا نکلے

راست گوئی شعار ہو جس کا
کام دُنیا میں اس کا کیا نکلے

یاد آئے تو آپ کی آئے
ذکر نکلے تو آپ کا نکلے

بے تعلق ہیں سب سے اے ساقی
رند مشرب ہی پارسا نکلے

کون ہے تجھ کو دیکھنے والا
سب ندیدے ہی مُبتلا نکلے

کثرتِ جلوہ کیوں بنی ہے حجاب ؟
حوصلہ بھی نگاہ کا نکلے

کون حق بات کو سنے ہادی
آپ ناحق غزل سرا نکلے

اِکتفا دل پہ کرے یا مری جاں تک پہنچے
غم کی قوت پہ ہے موقوف جہاں تک پہنچے

دل کے ارماں نہ کبھی سطحِ بیاں تک پہنچے
چاہیئے دل کو وہی کھچ کے زباں تک پہنچے

اُن کے دل میں نہ ملی۔ پائی جگہ محفل میں
ہم وہاں تک بھی پہنچتے۔ جو یہاں تک پہنچے

قصد جانے کا کہیں اور تھا اپنا لیکن
راستہ بھولتے ہی اُن کے مکاں تک پہنچے

قیس و فرہاد کا کیا کوئی بتائے گا مقام
کون پہنچا ہے وہاں تک؟ یہ جہاں تک پہنچے

کر دیا تو نے جو مایوس تو محرومِ وصال
جان پہ کھیل کے اللہ میاں تک پہنچے

اُن کو پہنچا ہوا کہتے نہیں اے شیخِ حرم!
جو مکیں سے نہ ملے اور مکاں تک پہنچے

دلِ ناداں! وہی عنوانِ شکایت ہو گا
ایک نالہ بھی جو بھولے سے زباں تک پہنچے

دل کے سب داغ تر و تازہ ہیں ہر دم حاوی
وہ بہار اپنی نہیں ہے جو خزاں تک پہنچے



پہلے دل کو سنبھال آئے
پھر آئے ترا خیال آئے

صورت نہ بگاڑیئے خدا را
دل میں بھی اگر ملال آئے

خوگر ہیں جمال کی جو آنکھیں
دیکھیں وہ تجھے۔ جلال آئے

جتنے مجھ پر زمانے گزرے
اب تک سب ایک حال آئے

اُن کی محفل میں باریابی؟
دل کی حسرت نکال آئے

یا کوئی تری نظیر دیکھوں
یا ذہن میں کچھ مثال آئے

دنیا دارالعمل ہے حاوی
مجھ کو میرا خیال آئے



یہ کیسے زندگی کے موڑ آئے
جسے مقدور ہو وہ مُسکرائے

کسے ہے عیش و عشرت میں ضرورت
خُدا کی یاد کیوں بے وقت آئے

حقیقت پھر حقیقت ہی رہے گی
کوئی لاکھ اُس کو افسانہ بنائے

صدائیں اُٹھ رہی ہیں درد انگیز
نہ جانے تُم نے کتنے دل دُکھائے

وہی محسن رہے گا یاد سب کو
جو احسانوں کو اپنے بھول جائے

پکارو اُس کو دِل ہی دل میں حاوی
وہ سُنتا ہے صدا جائے نہ جائے

نِکھرتا ہے غزل کا رنگ حاوی
اگر ہوں استعارے پاکنائے

اسی عالم میں پوری حسرت دیدار ہو جائے
نظر ایسی ملے جو آپ سے دو چار ہو جائے

انا کا ہے یہ مصرف آدمی خود دار ہو جائے
جو بڑھ چڑھ کر کہے کوئی سزا کے دار ہو جائے

بجا کہلائے جتنا نشۂ پندار ہو جائے
یہ پُتلا خاک کا خالق کا جب شہکار ہو جائے

مئے و مینا سے بچنے والے اس سے بچ نہیں سکتے
جو چشم مست ساقی ساغر سرشار ہو جائے

سفینہ اہل ایماں کا ہے طوفان حوادث میں
خدا کا فضل شامل ہو تو بیڑا پار ہو جائے

جسے کہتے ہیں استغفار زینہ ہے ترقی کا
مبارک وہ خطا جو وجہ استغفار ہو جائے

تصرف نفس و آفاق پر دیکھے کوئی اس کا
تری جانب سے جو مجبور بھی مختار ہو جائے

بتاؤں کیا مقام و مرتبہ قرب نوافل کا
یہاں پہنچے کوئی مجبور تو مختار ہو جائے

دم پرسش مشرف تو رہیں گے ہم کلامی سے
بلا سے نامہ اعمال اگر طومار ہو جائے

اگر ہو بندگی سچی تو مل جائے خدائی بھی
بنے سرکار وہ جو بندۂ سرکار ہو جائے

بہار آئے تو غنچوں کی طرح دل بھی شگفتہ ہو
یہ کھل جائے تو خود اپنی جگہ گلزار ہو جائے

چمن میں رہ کے نرگس اپنی بے نوری کے صدمے سے
نہ کیوں بیمار کہلائے نہ کیوں بیمار ہو جائے

پرانا ہو چکا ہے وادیٔ ایمن کا افسانہ
ندیدوں پر تجلی تیری پھر اک بار ہو جائے

یہ ہن کر جا رہی ہستی جو تو جائے سے باہر ہو
کرایہ کا یہی جوڑا گلے کا ہار ہو جائے

سلیقہ دیکھنے کا ہو تو پھر جس رنگ میں دیکھو
یہی عالم سراپا عالمِ انوار ہو جائے

وہ تیرا حسن جو آنکھوں میں آئے نور کہلائے
وہ تیرا عشق جو دل میں سمائے نار ہو جائے

سمائے جلوہ آنکھوں میں کہاں خود نور آنکھوں کا
جو گم ہو جائے جلوے میں نظر بیکار ہو جائے

برائے بیت ہے تو خوگرِ گفتار اے حاوی
وہ ہے گفتار جو آئینہ کردار ہو جائے

کچھ خبر ہے تجھے او روٹھ کے جانے والے
روٹھتے بھی ہیں کبھی تجھ کو منانے والے

وسوسے بڑھتے ہیں تاخیر سے آنے والے
ہم ہیں پل پل کی تری خیر منانے والے

آئینہ صاف دکھاتا ہے مقابل ہو کر
ایسے ہوتے ہیں ترے سامنے آنے والے

یہ تو کہیئے کہ پینہ کون اُٹھائے اُن کا
خود کو کھو بیٹھے ہیں جو آپ کو پانے والے

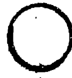
بے نیازی میں ہے کیا وعدہ خلافی بھی شریک
راہ پر آ نہ سکے راہ دِکھانے والے

یوں نگاہیں نہ چُرا، دُور سے کترا کے نہ جا
فرشِ رہ خود بھی ہیں آنکھوں کو بچھانے والے

انقلاب اُن کے عمل ہی کا صِلہ ہوتا ہے
خود بدلتے ہیں زمانے کو زمانے والے

حسبِ وعدہ کبھی دیکھے ہیں کسی نے یہ قدم
وعدہ کرتے ہوئے او ہاتھ ملانے والے

اُن کو پردے میں حدیثِ دگراں کے حاوی
آپ بیتی ہی سُناتے ہیں سُنانے والے



دل ہے وہ دل جس میں تیرا غم رہے
آنکھ ہے وہ آنکھ جو پُرنم رہے

غم چھپانے کو خوش و خرّم رہے
رنج میں ہنستے ہنساتے ہم رہے

لو نگاہِ پارسا کا امتحاں
سامنے جب کوئی نامحرم رہے

چشمِ ساقی کاشفِ اسرار ہے
طاقِ نسیاں پر ہی جامِ جم رہے

دخترِ رز منہ نہیں لگتی کبھی
شیخ محرم کے نامحرم رہے

شانہ اُلجھا ہے کسی کی زلف سے
باہمی یہ کشمکش پیہم رہے

ہم سے طوفانوں نے پائی زندگی
جانِ سیلابِ حوادث ہم رہے

دینے والا کس قدر ہوگا سخی
مانگنے والا اگر حاتم رہے

رشکِ مہر و ماہ بن اے داغِ دل!
اُن کے گھر میں روشنی مدّھم رہے؟

کس طرح سمجھوں ذرا سمجھائیے
یوں ہر اک جملہ اگر مُبہم رہے

نام جھنڈے پر چڑھایا عشق نے
کیوں نہ حاویؔ مالکِ پرچم رہے



ایک شعر

بھر کیا دکھائی دے گا بجز حادثات کے
جب دیکھنے کو حدِ نظر آسماں رہے

ہر دورِ زندگی کا تری کامراں رہے
حسنِ عمل جو تابعِ عمرِ رواں رہے

یوں بھی سبک کسی کی نظر میں کہاں رہے
سر تھا وبالِ دوش تو ہم سرگراں رہے

ہر انقلاب تحتِ مشیت جہاں رہے
بدنام ظلم ڈھانے پہ کیوں آسماں رہے

دورانِ زندگی کی نہ پوچھو ضیا فتنیں
مہمان حادثات رہے ہم جہاں رہے

سینے میں شاید اس لیے دل ہے چھپا ہوا
پردہ نشیں مکیں ہے تو پنہاں مکاں رہے

پاکیزگی نگاہ کی ہوگی تجھے نصیب
اپنی نظر کا آپ اگر پاسباں رہے

ان کی منافقت بھی ہے تہذیب یافتہ
جو تیرے ہم خیال نہیں ہم زباں رہے

وہ دل پہ حکمراں رہیں تو یہ لازمی نہیں
محکوم ان کا حق میں مرے حکمراں رہے

ہر سانحہ ہمارے ہی دم سے ہے سرخ رو
بے رنگ ورنہ اس کی ہر اک داستاں رہے



پھر کیوں فضا نہ اتنی مکدر یہاں رہے
مظلوم کی جب آہ کا ہر جا دھواں رہے

راہِ طلب میں حسرت و ارماں کا تھا ہجوم
تنہا بھی ہم بجائے خود اک کارواں رہے

گلشن کے پھول زینتِ دامن نہ بن سکے
کانٹوں سے ڈرنے والے جو دامن کشاں رہے

کہتے ہیں جس کو موت وہ نقلِ مقام ہے
اُٹھ کے جب یہاں سے چلے تو وہاں رہے

معراجِ دید یہ ہے کہ جلوے ہوں سامنے
دل کا عروج یہ ہے کوئی دلستاں رہے

دونوں جگہ میں آپ مکاں ہو کہ لامکاں
ننگِ وجود ہم جو بنے تو کہاں رہے

رکتی نہیں کبھی نگہِ حق نگر کہیں
ہے جن کے حق میں حدِ نظر آسماں رہے

آہوں میں زورِ دل کی حرارت کے ساتھ تھا
پہچان آگ کی تو یہی ہے دھواں رہے

اُردو کی پرورش میں ہمارا بھی خون ہے
رنگین و شوخ کیوں نہ دکن کی زباں رہے

ہر انقلاب تحتِ مشیت ہے جب یہاں
بدنام ظلم ڈھانے پہ کیوں آسماں رہے

بڑھتا ہے کہنہ مشقی سے زورِ کلام اور
حادی بڑھاپے میں جو طبیعت جواں رہے



زندہ رہنے پہ مجبور ہوں!
موت خود پاسباں ہوگئی!



سودائی تری زلف کے کیا جانے کہاں تھے؟
اُلجھے ہوئے بس ایک بلائیں تھے جہاں تھے

جو کچھ ترے دل میں تھے فقط وہم و گماں تھے
ہم ایسے نہ ویسے نہ چنیں تھے نہ چناں تھے

گو یوں تو فقط آپ ہی غارتگرِ جاں تھے
یہ ناز یہ انداز مگر طرّہ بر آں تھے

ہم آپ کی فرقت میں نہ معلوم کہاں تھے؟
یہ کہنے کی باتیں ہیں یہاں تھے نہ وہاں تھے

ہم کہتے ہیں تجھ سے کہ نہیں ہم ترے عاشق
جب ضد کی ہی ٹھہری جو نہیں تھے بھی تو ہاں تھے

دنیا میں تو کچھ دید کے قابل ہی نہیں تھا
اک قابلِ نظارہ حسینانِ جہاں تھے

دشمن کا مکاں آپ کا گھر ایک ہیں دونوں
میں کیسے کہوں آپ وہاں تھے کہ یہاں تھے

میں اس غمِ اُلفت سے تو بیتاب ہوں ایسا
یہ بھی نہیں معلوم کبھی تابِ دل و جاں تھے

گرمیِ محبت کبھی اُس تک نہیں پہونچی
ہونے کو مرے نالۂ دل شعلہ فشاں تھے

رہ رہ کے تڑپنے کا مزہ دل ہی سے پوچھو!
میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ کیا ذوقِ نہاں تھے

مایوسی کا باعث ہے جو کچھ صبر ہے دیکھو!
وہ شوق کا صدقہ تھا جو مصروفِ فغاں تھے

اک آپ مسیحا ہیں کہ مرتے ہیں ہزاروں
اک حضرت عیسیٰؑ بھی مسیحائے زماں تھے

یہ خوبیِ اُلفت ہے کہ ہر وقت ہم اے صیفؔ[1]
دشمن کی بُرائی سے بھی اپنے اچھے جہاں تھے



[1] یہ اُس وقت کی غزل ہے جب حضرتِ حاؔدی کا تخلص صیفؔ تھا۔ (اخگرؔ)

تھی بھلی بات مری سب تو بجا مان گئے
آپ کیا سمجھے خدا جانے بُرا مان گئے

بھولے بھالے تھے بہت اگلے زمانے والے
جو تجھے نامہ بر اے بادِ صبا! مان گئے

پھر نہ کی پیش کبھی ہم نے گزارش کوئی
اُن کے مکتوب کو قسمت کا لکھا مان گئے

کیا بتائیں تجھے اور روٹھنے والے ہم سے
روٹھنے کو بھی تری ایک ادا مان گئے

سختیاں جھیلی ہیں دنیا کی جو تو نے اے دل!
ہم بھی لوہا ترا اے مردِ خدا! مان گئے

کیوں نہ مانوں میں تری شکل کو معراجِ نظر
ماننے والے تو پتھر کو خدا مان گئے

دیکھ کر تجھ کو وہ کب ہوش میں رہ سکتے ہیں
ہر ادا کو جو تری ہوش رُبا مان گئے

آہ کرنے سے جو تسکین ہوئی کچھ دل کو
ہم اُسی کو ترے آنچل کی ہوا مان گئے

سوچیئے تو، ہیں طرف دار نہیں حادی کا
کیا بُرا اس نے کہا تھا جو بُرا مان گئے

حوصلہ مند ہیں دماغ چلے
بڑھ کے ملتے ہیں حادثوں سے گلے

کس کو اچھا سمجھتی ہے دُنیا
اس کی نظروں میں ہم بُرے ہی بھلے

جب چمن ہی کو آگ لگ جائے
آشیاں میرا کیا۔ جلے نہ جلے

کیا زمانے نے ان کا ساتھ دیا
جو زمانے کے ساتھ ساتھ چلے

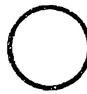
دیر پا وہ عروج کیا ہو گا
سر پہ سورج ہے سایہ پاؤں تلے

دیکھئے اب چراغ کے اُوپر
وہ اندھیرا جو تھا چراغ تلے

اور کیا کرتے طالبِ دنیا
ہاتھ آیا نہ کچھ تو ہاتھ مَلے

نہیں جسم و لباس پر اک داغ
دل جلوں سے نہ پوچھ۔ کیسے جلے

جو بُرا کہتے ہیں تجھے حاوی
تو برائی سے ان کا نام نہ لے



میں ہوں تنہا اور تنہائی نہیں حاصل مجھے
ہر خیال آتا ہے بن کر آپ کی محفل مجھے

یوں نہ لوٹا جانتے ہیں سب ترا سائل مجھے
ورنہ خالی ہاتھ دیکھے گی بھری محفل مجھے

جانے کیا صورت دکھائے اُس کا شوقِ بازدید
جس نے پہلی ہی نظر میں کر دیا بسمل مجھے

تجھ سے کیا مانگوں بھلا اے انقلابِ روزگار
ہے وہی مطلوب تھی جو عافیت حاصل مجھے

اُن کا منہ تکنا ہی بس ہے مانگنے کا کیا سوال؟
دیکھ کر صورت سمجھ جائیں گے وہ سائل مجھے

ہے وہ عاقل جو مجھے کہتا ہے دیوانہ ترا
ہے وہ دیوانہ سمجھ لیتا ہے جو عاقل مجھے

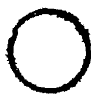
جائزہ لیتا نہیں کوئی بھی اپنے حال کا
ناز ماضی پر اُنھیں۔ امیدِ مستقبل مجھے

مجھ پہ طوفانوں کی رہتی ہے نگاہِ التفات
دیکھ سکتے ہی نہیں شرمندۂ ساحل مجھے

خوفِ سیلابِ حوادث سے کنارہ کیا کروں
سب خس و خاشاک سمجھیں گے لبِ ساحل مجھے

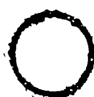
سامنا ہوتے ہی اُن کے پاؤں پر میں گر پڑا
مل گئی پہلے قدم پر آخری منزل مجھے

حسرتِ دیدار کا عالم ہے کیا حاوی نہ پوچھ
پردے آنکھوں کے دکھائی دیتے ہیں حائل مجھے



ایک شعر

کیا کہتے کس سے کہتے بھلا وارداتِ غم
گویا زبان رکھ کے بھی ہم بے زباں رہے



دُنیا قیام گاہ ہے یا رہ گزر مجھے
ذوقِ حضر ہے اور نہ لطفِ سفر مجھے

لے چل کہیں زمان و مکاں سے اُدھر مجھے
اے شوقِ جستجو نہ پھرا دربدر مجھے

دُنیا کو دیکھتی ہی نہیں وسعتِ نگاہ
اتنا بڑا مکان بھی ہے مختصر مجھے

فطرت جسے بنا رہی ہے وہیں سر جھکے مرا
ہوتا ہے جس کی ذات سے نفع و ضرر مجھے

موقف مرا کہاں؟ مری منزل ہے کس طرف؟
لے جا رہا ہے آج زمانہ کدھر مجھے

میرا کمال نقص، مرا نقص ہے کمال
پہچانتی نہیں ہے کسی کی نظر مجھے

ذات اُن کی خیر محض ہے شر کا ثبوت کیا
سمجھائے کوئی مسئلۂ خیر و شر مجھے

دل آپ کا مقام ہے دل کا مقام کیا ؟
پہنچایا کس نے عرشِ بریں سے اُدھر مجھے

جن کی کوئی غرض ہی نہ ہو جز رضائے دوست
اب ایسے لوگ کیوں نہیں آتے نظر مجھے

یہ ساری صورتیں بھی تو ہیں مستقل حجاب
اک آسمان ہی نہیں حدِ نظر مجھے

حادیؔ اگر میسّر خلافت نہیں تو کیا
ان کا پتہ چلاتے ہیں سب دیکھ کر مجھے



ایک شعر

حُسنِ قبول اس سے زیادہ ہو اور کیا
موضوعِ گفت وگو جو مری داستاں ہے



آیا ہے یہ دل اُن پہ جو آیا نہیں کرتے
خاطر میں کسی شخص کو لایا نہیں کرتے

آتے ہیں ترے کوچے میں ٹھہرا نہیں کرتے
رسوائے محبت تجھے رسوا نہیں کرتے

دلچسپ کوئی شغل ہی دنیا میں نہیں تھا
کیا کرتے اگر تیری تمنا نہیں کرتے

مقصود بیاں اپنا بیاں کرتے ہیں اُن سے
تمہید بیاں ہم کبھی سوچا نہیں کرتے

بیمار محبت کو مداوا سے غرض کیا
اچھا ہے کہ ہیں آپ جو اچھا نہیں کرتے

مجبوری یہ کرتی ہے یہ حضرت دل کے
مختار اگر ہوتے تو کیا کیا نہیں کرتے

لیتے ہیں مزے بنکے تمنائے مجسم
یہ آپ سے اظہار تمنا نہیں کرتے

جب چھڑ ہی گیا تذکرۂ رنجش باہم
سلجھائے کا یہ موقع ہے الجھا نہیں کرتے

دُنیا کے بدلنے کی تو پروا نہیں کرتے
ہم تیرے بدلنے کو سہارا نہیں کرتے

اُٹھتا ہے تو اے دردِ جگر کیوں پئے تعظیم
تشریف وہ لاتے ہیں تو بیٹھا نہیں کرتے

جب شرم سے ہو جاتی ہے نیچی نظر اُن کی
کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ دیکھا نہیں کرتے

بُت بننے کی کیا بات ہے کچھ بات بھی کیجے
ہم ایسے پرستار تو پوجا نہیں کرتے

منہ آپ کا تکتے ہیں یہی حسنِ طلب ہے
منہ پھوڑ کے جو آپ سے مانگا نہیں کرتے

تاثیرِ دُعا چاہتے ہیں پہلے دُعا سے
وہ مانگتے ہیں لوگ جو مانگا نہیں کرتے

آساں نہیں در سے ترے ناکام گزرنا
ہم خود سے گزر جاتے ہیں گزرا نہیں کرتے

سرکار کے اس فہم و فراست کے تصدق
اُلٹا مجھے سمجھاتے ہیں سمجھا نہیں کرتے

محشر میں نکل جائے گی پرسش کی تمنا
حادی جو تجھے آج وہ پوچھا نہیں کرتے



ہم نہیں کھاتے غم زمانے کے
غم ہی در پے ہے ہم کو کھانے کے

ہر تغیر ہے درسِ بیداری
ناروا ہیں گِلے زمانے کے

سمٹ آئی ہے وسعتِ کونین
چار تنکوں میں آشیانے کے

وہ گئے دن کہ اک زمانے تک
دل میں ارمان تھے زمانے کے

کام لینے کو جو بنا ہے دوست
کیا وہ قابل ہے کام آنے کے ؟

خرمنوں کو لٹانے والے بھی
ہوئے محتاج دانے دانے کے

چال ایسی چلو محبت کی
جو بدل دے چلن زمانے کے

نظر آتے ہیں آج کیوں مجبور
کل جو مختار تھے زمانے کے

اپنا تھے رو کبھی زمانہ تھا
اب تو پے رو رہیں ہم زمانے کے

خود پہ نازاں ہیں آشیاں برباد
صرف چرچے پہ آشیانے کے

دیکھ بندوں کو وقت کے حادی
چومتے ہیں قدم زمانے کے



ایک شعر

دولت تو چلتی پھرتی ہوئی رہ گئی یہیں
وہ الکانِ دولت وحشمت کہاں گئے



پھول بکھرا گئے ترے رُخسار کے
بھاؤ کیا کچھ بڑھ گئے بازار کے؟

کیا کہوں کہیئے سوا سرکار کے؟
اور کیا آداب ہیں گفتار کے؟

رہ گزر پر تیری کر لیں گے گزر
بیٹھ جائیں گے جو دھونی مار کے

فتنے محشر کے سبھی محشر سبھی
پیچھے پیچھے ہیں تری رفتار کے

تیری محفل میں نہ ہو کیوں اختلاف
لوگ ہوں جب مختلف کردار کے

تو مکرر نام سے مجھ کو پکار
منتظر ہیں کان اس تکرار کے

دے لگا ہوں گو زباں کا جائزہ
کان بھی ہوتے ہیں جب دیوار کے

کھنچ گئے وہ جب کدورت بڑھ گئی
ہم بھی ہیں سائے میں کس دیوار کے؟

پھر گئیں ان کی نگاہیں دنگ ہوں
تیر سے نکلے ہیں رُخ تلوار کے

بر نہیں آئی کوئی من کی مُراد
ڈھل گئے منکے مگر بیمار کے

کیا لکھوں حاوی اب اس عنوان پہ
قاعدے قانون کیا ہیں پیار کے



ایک شعر

لگ جائے آگ آتشِ گُل ہی سے باغ کو
جب ہم نہ ہوں تو کس کے لیے گُلستاں رہے

بات ہم سے عدو بنا نہ سکے
منہ کی کھائی تو منہ پہ آ نہ سکے

منّتِ الفاظ کی اُٹھا نہ سکے
دل میں جو تھا زباں پہ لا نہ سکے

اُن کا برتاؤ ناگوار کہاں؟
ہم اگر زیرِ بحث لا نہ سکے

اس نے تیور سے کرلیا محسوس
دل کی تشویش ہم چھپا نہ سکے

اتنا دل چسپ اور ملکِ عدم؟
جو گئے پھر پلٹ کر آ نہ سکے

دل کسی پہ جو ٹوٹ کر آیا
کسی پہلو سے ہم بچا نہ سکے

موت بے انتظار ہی آئی
منتظر جن کے تھے وہ آ نہ سکے

خود کو یادش بخیر بھول گئے
اُس کو دل سے مگر بھلا نہ سکے

صبرِ ایوبؑ اور ہم کیا خوب؟
خیر گزری وہ آزما نہ سکے

پڑ گئی اوس خندۂ گل پر
یہ تمہاری ہنسی اُڑا نہ سکے

دیدہ و دل کی بے بساطی کیا
ان کے جلوے کہیں سما نہ سکے

ہے ملامت ضمیر کی ایسی
جس کی آواز کو دبا نہ سکے

عرش کے ساتھ ہوگی عرش کی بات
دل کی وسعت کو لوگ پا نہ سکے

آنکھ سے گر گئے جو کچھ آنسو
ان کو نظروں سے ہم گرا نہ سکے

وہ خلافِ اُمید آ پہنچے
اپنی آنکھیں بھی ہم بچھا نہ سکے

میں تصدق ترے تبسم پر
غنچے اس طرح مُسکرا نہ سکے

عظمتِ نقشِ پا خُدا جانے
ہم تو سجدے سے سر اُٹھا نہ سکے

دل ہے معمارِ آرزو حادی
وہ عمارت بنی کہ ڈھا نہ سکے

کچھ آپ کی طرح نہ گئے اختیار سے
ملتے ہیں یوں تو ملنے کو ہم بھی ہزار سے

کس کس ادا سے بات بنائی ہے یار سے
منت سے عاجزی سے خوشامد سے پیار سے

یہ دل ہے واقفِ ست اگر وہ ہیں مست ناز
گھٹتی ہے بادہ خوار کی اب بادہ خوار سے

ہم کچھ نہ پائے تجھ سے اگرچہ غریب لوگ
پاتے ہیں آسرا شجرِ سایہ دار سے

یہ دل عجیب دل ہے مصیبت نصیب دل
تکلیف رنج سے نہ خوشی اس کو پیار سے

رُک رُک کے سوچ سوچ کے رہ رہ کے ظلم ہے
پالا پڑا ہے ایسے کفایت شعار سے

ہے زیرِ غور چاہنے والے کا چاہنا
ایسے بھی وہ نہیں ہیں کہ پوچھیں گے چار سے

لینا عدو کی جان بھی محشر میں۔ دِل تو لو
بہتر ہے نقد آج کا کل کے اُدھار سے

ہادیؔ جنھیں کچھ اپنی شرافت کی لاج ہے
برتاؤ ایک رکھتے ہیں اغیار و یار سے

ہوئے محجوب کیا میری نظر سے
اُدھر اُن کا جو رُخ بدلا اِدھر سے

کوئی پوچھے تری نیچی نظر سے
کہ خود واقف بھی ہے اپنے اثر سے

نہ پوچھو خانہ ویرانی کی وسعت
بیاباں بھی نظر آتے ہیں گھر سے

نتیجے میں ملاتی ہے دِلوں کو
نظر پہلے جو لڑتی ہے نظر سے

دکھائے جو بھی دُنیا دیکھتا جا
مگر سطحی نہیں غائر نظر سے

سرِ محفل نہ پکڑے کوئی چوری
نہ دیکھو مجھ کو دُزدیدہ نظر سے

بُرائی سے بُرائی ہوگی پیدا
نہ رکھو خیر کی اُمید شر سے

وہاں تجلیس لفظی کا محل کیا؟
جہاں شر کی اِشاعت ہو بشر سے

نظر اسباب پر پڑتی ہے سب کی
مسبب ہے جو پوشیدہ نظر سے

کر چکا ہوں کنارہ ساحل سے
پوچھ طوفان کو مرے دل سے

گو قدم اٹھ رہے ہیں مشکل سے
ہو رہا ہوں قریب منزل سے

دل کو اُن سے لگاؤ ہے لیکن
لاگ اُن کی نظر کو ہے دل سے

کر دیا تو نے ایسا مستغنی
اغنیا بھی ہیں دنگ سائل سے

کی تلاطم نے پرورش میری
آنکھ نا آشنا ہے ساحل سے

کیوں یہ دونوں ہیں لازم و ملزوم
حق کا رشتہ نہیں جو باطل سے

وہ پسِ پردہ بھی نمایاں ہیں
جلوہ چھپتا نہیں ہے محمل سے

رفعتِ عرش تو مسلّم ہے
پھر بھی اونچا نہ ہو سکا دل سے

جانتا ہے جو سب کے دل کا حال
اس کو حاؔدی پکار تو دل سے

کھل گیا ان کا بھرم کردار سے
کس قدر بے ربط ہے گفتار سے

شوقِ گُل میں دامن اُلجھا خار سے
چاک دامن بھر گئے گل زار سے

دل ہیں ارمانوں کی کثرت، دنگ ہوں
جا سے تنگ و مردماں بسیار سے

چار عنصر سے بنا ہے آدمی
اور مر کر بھی اُٹھے گا چار سے

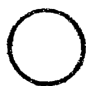
چشمِ بینا دیکھتی ہے پیشگی
آنے والے دَور کو آثار سے

وہ نظر تو پڑتے پڑتے پھر گئی
کٹ گئے ہم دل ہیں کس تلوار سے

ہاتھ خالی طالبِ دُنیا گئے
کچھ نہ پایا اس بھرے بازار سے

آگ میں دیکھے بھرا اپنے دوست کو!
نور نے چھینی حرارت نار سے

شعر بھی حاؔوی ترے خوددار ہیں
داد کے طالب نہیں اغیار سے



گرے نیچے جو آنسو چشمِ تر سے
وہ کیا پانی ہے اونچا اپنے سر سے

ضمیر و نفس میں یہ کشمکش کیوں
ملا دو راہ زن کو راہ بر سے

ترے قربان افتادِ محبت!
نہ گرتی ورنہ یہ دنیا نظر سے

لبِ خشک اور چشمِ تر سلامت
مجھے کیا واسطہ اب بحر و بر سے

نظر اب منزلِ مقصود پہ ہے
مسافت گھٹ گئی عزمِ سفر سے

بکھرے بیٹھے ہیں وہ کھلتا نہیں کچھ
گھٹا گھن گھور چھائی ہے تو بر سے

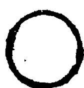
نہ جاؤ دل سے آنکھوں میں سما کر
اتر آتے ہو جب دل میں نظر سے

نہ گھورو گھورنے والوں کو اپنے
یہ ناواقف ہیں آدابِ نظر سے

قوی اتنا ہو تیرا عزمِ پرواز
قفس ٹوٹے شکستہ بال و پر سے

میں تیرا نام لے کر جی رہا ہوں
زمانہ کام لیتا ہے اثر سے

مدبّر بھی ہیں دُنیا ساز حادی
یہ ہر اک عیب کرتے ہیں ہنر سے



ایک شعر

رکھے گا دوسروں سے وہاں کیا گمانِ نیک
تو اپنے آپ ہی سے جہاں بدگماں رہے

اور کیا تکلیف پہنچی گردشِ ایام سے
ہم ذرا کروٹ بدل کر سو گئے آرام سے

دینے والے کے تصدق دل دیا حسبِ مذاق
آشنا تکلیف سے نا آشنا آرام سے

ملتے ہیں خلوت میں کچھ ان کے تصور کے مزے
چین سے فرصت سے اطمینان سے آرام سے

دل پہ جب قابو تھا ہم بھی کام کے تھے آدمی
اب تو اس خودکام کی خاطر گئے ہر کام سے

ہے تماشا گاہ دُنیا کھیلتا ہوں رات دن
انقلابِ روزگار و گردشِ ایام سے

او جفا پیشہ وفا نا آشنا پیماں شکن
آئنہ ہے تیرا ہر اک وصف تیرے نام سے

میری آنکھوں سے سمجھ جاتے ہیں دل کی آرزو
آپ کی مردم شناسی کم نہیں الہام سے

سچ تو یہ ہے عاقبت بینی نہیں تیرا شعار
ورنہ ہر آغاز نا واقف نہیں انجام سے

وقتِ آخر بھی رہے حاوی وہی وردِ زباں
روزِ پیدائش ہوئے کان آشنا جس نام سے

دل میں ہنگامۂ محشر سہی ارمانوں سے
گھر کی رونق میں اضافہ تو ہے مہمانوں سے

جو بھی ملتے ہیں ترے چاک گریبانوں سے
بھانپ لیتے ہیں مضامین کو عنوانوں سے

ہم سبک سر ہیں بھلا ان سے ہماری نسبت
جن سے سر اُٹھ نہیں سکتے ترے احسانوں سے

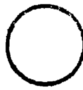
خوش نما ہوتے ہیں کانٹے بھی جگہ پہ اپنی
پھول کمھلا گئے نکلے جو گلستانوں سے

نہیں رہ سکتے یہ فیضانِ جنوں سے محروم
دامنوں کا بھی تو رشتہ ہے گریبانوں سے

بے نیازی ہیں گدا آپ کے ٹھہرے ممتاز
بادشاہوں سے جہاں بانوں سے سلطانوں سے

دھو کے پی لیجئے اب دفترِ دانائی کو
سابقہ آج شب و روز ہے نادانوں سے

ہے ہر اک موج کے سینے پہ سفینہ حادی
ہم تو کچھ اور ابھر جاتے ہیں طوفانوں سے



کوئی نازاں ہے قسمت پر کوئی خوش اپنے دلبر سے
مگر ہم نے بجز حسرت نہ پایا کچھ مقدر سے

اسی باعث بتونکی ہر زمانے میں ترقی ہے
کہ پہلے پائے ہیں نشو و نما اللہ کے گھر سے

مرے داغِ جگر سکّے ہیں گویا اون کی اُلفت کے
لڑا ہے کیسے بے زر کا مقدر بھی سکندر سے

بہار آئی ہے پھر لوٹیں گے جوبن دُخترِ رز کا
صراحی سے سبو سے جام سے مینا سے ساغر سے

وہ شیریں لب وہ میٹھی میٹھی باتیں اُس ستمگر کی
مرے لب بند ہو جاتے ہیں اِس قندِ مکرر سے

لگی رہتی ہے لَو ہر دم کسی کے آتشیں رُخ کی
مرے دل نے عجب انداز سیکھا ہے سمندر سے

غزل اے صیفؔ[1] کیوں کر ہو تعلّم کے زمانہ میں
پھر اُس پر ہم کو فرصت ہی نہیں ملتی ہے دفتر سے

۱ دیکھئے تذکرہ

حیران ہوں حضور کی اِس رسم و راہ سے
نزدیک دل سے دور ہیں میری نگاہ سے

نسبت ترے فقیر کو کیا بادشاہ سے
اونچے مقام پر ہے وہ نیچی نگاہ سے

دُنیا کا خون دیکھ ہمارا نصیب دیکھ
واقف اگر نہیں ہے سفید و سیاہ سے

نادان! مدرسہ میں کہاں درسِ بے خودی
یہ میکدے سے پائے گا یا خانقاہ سے

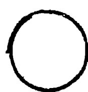
دربان کا کیا اثر ہو بھلا گھر کے چور پر
پوشیدہ ہیں ضمیر کے دھوکے نگاہ سے

حاصل جو اِس مقامِ شہادت میں ہو شہود
مومن کے حق میں ہے وہی [illegible] نگاہ سے

ثابت ہے اس سے نفیٔ صفات و وجود بھی
نفیٔ الوہیت ہی نہیں لا الٰہ سے

عالم تمام مظہرِ اسم و صفات ہے
کس کس کو دیکھے نگہِ اشتباہ سے

حاؔدی بتاؤں کیا شہِ بغداد کا کرم
رہزن بنے ہیں راہبر اُس بارگاہ سے



سر میں سوائے انانیت اگر موجود ہے
بس یہی شیطان ہے ابلیس ہے مردود ہے

جلوے رنگا رنگ بے حد ہیں نظر محدود ہے
کون اُسے دیکھے جو خود شاہد ہے خود مشہود ہے

زندگی کی ہر کڑی آساں ہے آگے عشق کے
موم لوہے کو جو کر دے وہ کفِ داؤدؑ ہے

جس طرف دیکھو پرستش ہے ہوائے نفس کی
حق تعالیٰ کیا برائے نام ہی معبود ہے؟

زندگی وہ زندگی جو ہو مجسّم اضطراب
لے تڑپنے کے مزے شوقِ سکوں بے سود ہے

جس نے تجھ کو جان دی ہے تو بھی اس پر جان دے
ورنہ یہ جینا عبث یہ زندگی بے سود ہے

ہے عدم اپنا اضافی حاملِ وہم و وجود
یعنی جو موجود پہلے تھا وہی موجود ہے

بندگی کر پھر دکھا اس کی خداوندی کی شان
بن ایاز ایسا کہ دنیا چیخ اُٹھے محمود ہے

پیروِ دینِ حنیفی ہیں بھی ہو شانِ خلیل
مادرِ گیتی کا سینہ آتشِ نمرود ہے

سجدہ ہے سرافگنی لیکن ہے ایسا قربِ رب
عرش پہ ساجد ہے یا پھر فرش پہ مسجود ہے

دل کا ہر گوشہ ہو روشن جس سے ہے وہ نورِ مہر
مہرِ عالمتاب کا نام آتشِ بے دود ہے

دعویٰ دارانِ انا ابلیس بھی منصور بھی
دوسرا مقبول پہلا مدعی مردود ہے

لوگ کیا جانے کسے کہتے ہیں مرگِ ناگہاں
موت بھی تو خود رہینِ مدتِ معہود ہے

طے نہیں ہوتا کسی منزل پہ سالک کا سلوک
ہر نئی منزل دلیلِ منزلِ مقصود ہے

شیوۂ اہلِ حسد کیا ہے شکایت کے سوا
شکر کر حادی کہ تو حاسد نہیں محسود ہے

نہ ہو جامے سے باہر دل مرے سینے کے اندر ہے
”یکے نقصانِ مایۂ کیا کھول۔ یہ اے ستمگر ہے

ہجومِ یاس و حسرت سے ہے دل کی خانہ ویرانی
ہمارا کیا اسے جیسا بھی رکھیئے آپ کا گھر ہے

علامت سرکشی کی ہے فلک کی سرنگونی بھی
یہ شاہد سوچتا رہتا ہے میرا کون ہمسر ہے

جگر نے درد پایا۔ سر نے سودا رنج و غم دل نے
وظیفہ عشق کی سرکار سے سب کو مقرر ہے

جنابِ شیخ بھی اب پڑ گئے دنیا کے پیچوں میں
بظاہر دیکھنے کو تو بڑا شملہ بڑا سر ہے

یہ زاہد تارکِ دنیا بھی ہے دنیا کا طالب بھی
اجیرن اس کو جینا ہی نہیں مرنا بھی دوبھر ہے

دکھاتے ہیں گدائی میں بھی شانیں بادشاہی کی
بڑے رتبے ہیں جن کا اُن کے دروازے پہ بستر ہے

سمجھتا تھا کہ اک پتھر کے نیچے ہاتھ ہے میرا
مگر اس بُت نے چھوڑا ساتھ جب سے ہاتھ پتھر ہے



قیامت آبھی جائے تو مجھے کیا خوف ہے ڈر ہے
تری محشر خرامی کا ابھی آنکھوں میں منظر ہے

وہ پابندِ جفا یہ دل ستم سہنے کا خوگر ہے
مگر کیا ظالم و مظلوم کا پلہ برابر ہے ؟

بھلا کب کوئی چشمِ مستِ ساقی کے برابر ہے
نہ پیمانے کا ظرف اتنا نہ اتنا ظرفِ ساغر ہے

نہ سر محتاجِ بالیں ہے نہ تن مرہونِ بستر ہے
تکلف برطرف فرشِ زمیں آغوشِ مادر ہے

جو رتبہ دوستی کا ہے قرابت سے بھی بڑھ کر ہے
برادر بھی اگر ہو دوست تو بے شک برادر ہے

وہ سرگرمِ تماشا اور میں غرقِ ندامت ہوں
کہ گویا میرے سر پر آفتابِ روزِ محشر ہے

مرے دل پر ہے جو نقش و نگارِ داغِ ناکامی
بہت ہی کم سہی لیکن بڑا پُر کیف منظر ہے

یہ کیوں ہم فاقہ مستوں سے تیری پھر گئیں آنکھیں
ترے قربان ساقی! یہ بھی کوئی دورِ ساغر ہے؟

چلے آتے ہیں بے کھٹکے جو سارے وسوسے دل میں
نہیں معلوم یہ بازار ہے یا آپ کا گھر ہے؟

تعجب ہے کہ جس کی یاد نے تڑپا دیا دل کو
اسی کی یاد پھر وجہِ سکونِ قلبِ مضطر ہے

تری چشمِ عنایت سے بہت جی کھل گیا میرا
کہ دل کے چاک میں تیرِ نظر چھری کیا خنجر ہے

شکر رنجی کی اس شیریں سخن کی گفتگو دیکھو
مزے میں تلخ تو ہوتی ہے لیکن پھر بھی شکر ہے

اگرچہ دل کی گنتی تو ہے اعضائے رئیسہ میں
مگر یہ خسروِ اقلیمِ تن بے تخت و افسر ہے

کوئی شطرنج کی بازی ہے جاں بازی محبت کی؟
جو نکلے چال کوئی مات کی؟ یہ موت کا گھر ہے

ہوس کاروں کا سرمایہ نہیں اس کے سوا کچھ بھی
کہ یا تو بازوؤں میں زور ہے یا جیب میں زر ہے

ضرورت آئینے کی شوقِ خود بینی نے پیدا کی
جو سچ پوچھو تو اپنا آپ آئینہ سکندر ہے

بہت سچ ہے کہ مجمع بے شعورِ محض ہوتا ہے
تری محفل کے اندر جو بھی ہے آپے سے باہر ہے

جو دل ہے آدمی کا سخت بھی ہوتا ہے نازک بھی
یہ شیشے کا ہے شیشہ اور پتھر کا یہ پتھر ہے

اضافہ حسن میں کرتی ہے یہ نیچی نگہ تیری!
ترقی کرنے والوں کی نظر حالانکہ اُوپر ہے

نہ ہوں کیوں دل شکستہ پھر تمہارے چاہنے والے
کہ دیکھو لفظ خود عشاق کا جمعِ مُکسّر ہے

محبت اندھی ہوتی ہے تو کیا اندھا بھی کرتی ہے
کہ جیسے ایشیا کا رودکی[1] یوریپ کا ہومر[2] ہے

بہت خود رو ہے پیداوار اپنی فکر کی حاوی
زمینِ گلشنِ شعر و سخن مدت سے بنجر ہے



۱ ۲ دیکھئے تلمیحات صفحہ ___



کیا پُر آشوب یہ زمانہ ہے
جس سے سُنئے نیا فسانہ ہے

کیا بتاؤں کہاں ٹھکانہ ہے
نہ قفس ہے نہ آشیانہ ہے

ہوں قفس میں تو کیا تصور میں
آشیانہ ہی آشیانہ ہے

سُنئے ارشادِ لَا تَسُبُّوا الدَّھر
قابلِ قدر ہر زمانہ ہے

تھے ترانے کبھی مسرت کے
نالۂ غم ہی اب ترانہ ہے

کیا حقیقت یہ اپنی غور کروں
یہ حقیقت نہیں فسانہ ہے

رنگِ محفل پہ ہے تعجب کیوں
یہ بھی نیرنگیٔ زمانہ ہے

کیوں نہ ہو تیز گام توسنِ عمر
ہر نفس ایک تازیانہ ہے

ہے جو قدموں سے آپ کے محروم
نام اُس کا غریب خانہ ہے

لاکھ آرام ہو قفس میں تو کیا
آشیانہ پھر آشیانہ ہے

آپ سُنتے نہیں جو حاوی کی
بات یہ غیر شاعرانہ ہے



ایک شعر

پاکیزگی نگاہ کی ہوگی تجھے نصیب
اپنی نظر کا آپ اگر پاسباں رہے



پوچھو زمانے ہی سے ذرا کیا جواب ہے
ہم خود خراب ہیں کہ زمانہ خراب ہے

دل کو کبھی سکون کبھی اضطراب ہے
احساسِ زندگی بھی ثواب و عذاب ہے

میں اک نیاز مند ہوں وہ ایک بے نیاز
میرا جواب ہے نہ تو اُن کا جواب ہے

مربوب اور رب میں نہیں ہے کوئی حجاب
جو کچھ ہے وہ قصورِ نظر کا حجاب ہے

محتاج ہو جو اپنی ہی ذات و صفات میں
قابض ہے کائنات پہ کیا انقلاب ہے

کیفیت اس کی آ نہیں سکتی ہے بیان میں
غصّے کو پی کے دیکھ یہ کیسی شراب ہے

سمجھو تعینات میں ہر مرتبہ کا فرق
پانی ہی گرچہ قطرہ و موج و حباب ہے

ضرورت آئینے کی شوقِ خود بینی نے پیدا کی
جو سچ پوچھو تو اپنا آپ آئینہ سکندر ہے

بہت سچ ہے کہ مجمع بے شعورِ محض ہوتا ہے
تری محفل کے اندر جو بھی ہے آپے سے باہر ہے

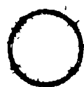
جو دل ہے آدمی کا سخت بھی ہوتا ہے نازک بھی
یہ شیشے کا ہے شیشہ اور پتھر کا یہ پتھر ہے

اضافہ حسن میں کرتی ہے یہ نیچی نگہ تیری !
ترقی کرنے والوں کی نظر حالانکہ اُوپر ہے

نہ ہوں کیوں دل شکستہ پھر تمہارے چاہنے والے
کہ دیکھو لفظ خود عشاق کا جمعِ مکسّر ہے

محبّت اندھی ہوتی ہے تو کیا اندھا بھی کرتی ہے
کہ جیسے ایشیا کا رودکی[1] یورپ کا ہومر[2] ہے

بہت خودرو ہے پیداوارِ فکر کی حاوی
زمینِ گلشنِ شعر و سخن مدت سے بنجر ہے



۱ ۲ دیکھئے تلمیحات صفحہ ـــ



کیا پُر آشوب یہ زمانہ ہے
جس سے سُنئے نیا فسانہ ہے

کیا بتاؤں کہاں ٹھکانہ ہے
نہ قفس ہے نہ آشیانہ ہے

ہوں قفس میں تو کیا تصور میں
آشیانہ ہی آشیانہ ہے

سُنئے ارشادِ لَاتَسُبُّوا الدَّھْر
قابلِ قدر ہر زمانہ ہے

تھے ترانے کبھی مسرّت کے
نالۂ غم ہی اب ترانہ ہے

کیا حقیقت پہ اپنی غور کروں
یہ حقیقت نہیں فسانہ ہے

رنگِ محفل پہ ہے تعجب کیوں
یہ بھی نیرنگئ زمانہ ہے

کیوں نہ ہو تیز گام توسنِ عمر
ہر نفس ایک تازیانہ ہے

ہے جو قدموں سے آپ کے محروم
نام اُس کا غریب خانہ ہے

لاکھ آرام ہو قفس میں تو کیا
آشیانہ پھر آشیانہ ہے

آپ سنتے نہیں جو حاوی کی
بات یہ غیر شاعرانہ ہے



ایک شعر

پاکیزگی نگاہ کی ہوگی تجھے نصیب
اپنی نظر کا آپ اگر پاسباں رہے



پوچھو زمانے ہی سے ذرا کیا جواب ہے
ہم خود خراب ہیں کہ زمانہ خراب ہے

دل کو کبھی سکون کبھی اضطراب ہے
احساسِ زندگی بھی ثواب و عذاب ہے

میں اک نیاز مند ہوں وہ ایک بے نیاز
میرا جواب ہے نہ تو اُن کا جواب ہے

مربوب اور رب میں نہیں ہے کوئی حجاب
جو کچھ ہے وہ قصورِ نظر کا حجاب ہے

محتاج ہو جو اپنی ہی ذات و صفات میں
قابض ہے کائنات پہ کیا انقلاب ہے

کیفیت اس کی آ نہیں سکتی بیان میں
غصّے کو پی کے دیکھ یہ کیسی شراب ہے

سمجھو تعینات میں ہر مرتبہ کا فرق
پانی ہی گرچہ قطرہ و موج و حباب ہے

جیسا عقیدہ ویسا ہی اُس کے لیئے شہود
کیا جانیئے کہ کون کہاں باریاب ہے

دل حامل اَنَا ہے اَنَا ہے محلِّ علم
سادہ سا یہ ورق ہی مکمل کتاب ہے

ہوتی ہے ضبط گریہ سے بھی بے خودی نصیب
آنسو کے پینے والو یہ پانی شراب ہے

پیرِ مغاں نے رنگِ سخن ہی بدل دیا
حادیؔ مرے کلام میں کیفِ شراب ہے



ایک شعر

ہے کتنی لطیف عشق کی آگ
بے داغ ہے جسم جل رہا ہے



آج ہر آدمی پہ حیرت ہے؟
کیا یہی شاہکارِ قدرت ہے؟

جو زیادہ ہو خرچ کرنے سے
وہ فقط علم و فن کی دولت ہے

اس پہ احسان کیا ہے حضرتِ دِل
آپ کو ہے اگر محبّت ہے

نقدِ دل اور کوڑیوں کے مول
حضرتِ عشق کی بدولت ہے

وہ زمانہ ہے جو بدل جائے
جو نہ بدلے کبھی وہ فِطرت ہے

مہربانی میں وہ نہیں مِلتی
جو تری بے رخی میں لذّت ہے

چُپ نہیں آتے آنکھ میں آنسو
ان کو حادی تلاشِ رحمت ہے

دل کے ہر گوشے میں آبادی نہیں ویرانہ ہے
کس طرح باور کروں یہ اُن کا دولت خانہ ہے

اپنے معنیٰ سے مُعرّا ہو گیا لفظِ خلوص
بار لوگوں کا عمل خالص ریاکارانہ ہے

آپ کو پہچان لیتا ہو جو ہر اک بھیس میں
کیوں اُسے کہتے ہیں سب دیوانہ۔ وہ دیوانہ ہے

سوختہ جانوں سے اپنے آپ بھی واقف نہیں
اور دنیا بھر میں شہرت یافتہ پروانہ ہے

مجھ کو متوالا بنایا اُس کی چشمِ مست نے
ہے یہی وہ میکدہ جو صورتِ پیمانہ ہے

جانتے ہیں سب یہی۔ تو ہے یگانہ حُسن میں
یہ تماشا کیا ہے جلوے سے نظر بیگانہ ہے

خونِ ارماں سے نکھر آیا ہے رنگِ داستاں
دوسرے الفاظ میں یہ سرخیِ افسانہ ہے

رُوپ بہرے دیکھ کر بہروپ تیرے دیکھکر
ہوش والے گم ہیں۔ دیوانہ تو پھر دیوانہ ہے

نکلیں گے ساوی زباں کے نت نئے پہلو بہت
"گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے"



عشق پر کس کا زور چلتا ہے
سب کا کس بل یہاں نکلتا ہے

گھر بناتا ہے دوسرا دل میں
ایک ارماں اگر نکلتا ہے

حُسن پر اس کے جان دیتا ہوں
رعب سے جس کے دَم نکلتا ہے

حالِ افتادگانِ عشق نہ پوچھ
کون اس راہ میں سنبھلتا ہے

جس کو سینے سے ہم لگاتے رہیں
وہی چھاتی پہ مونگ دلتا ہے

رنگِ دنیا نہ دیکھ اُس کو دیکھ!
تیری دُنیا کو جو بدلتا ہے

کر عمل اپنا استوار یہاں
یہ وہاں تیرے ساتھ چلتا ہے

شرم سے آفتاب ڈھلتا ہے
اُن کے آگے چراغ جلتا ہے؟

خود زمانہ ہے ہم رکاب اس کے
وہ زمانے کے ساتھ چلتا ہے؟

یہ توقع ہی دل سے کیوں رکھوں
اب سنبھلتا ہے جب سنبھلتا ہے

زندگی کا ہے انقلاب ایسا
جیسے کروٹ کوئی بدلتا ہے

دل بے حس یہ داغ ناکامی
یا چراغِ مزار جلتا ہے

اور ہستی کی ہے بساط ہی کیا
ایک سایہ سا ہے جو ڈھلتا ہے

سوزِ اُلفت ہے زندگی دل کی
آگ ہی سے یہ پھول پھلتا ہے

وقت کی اپنے قدر کر حادی
تیرے ہاتھوں سے جو نکلتا ہے

ایسی بسی ہوئی شبِ غم تو نظر میں ہے
کوئی دم سحر بھی اُمیدِ سحر میں ہے

نی کچھ نہ کچھ ضرور کوئی لفظِ شر میں ہے
دیکھو تو شر کو لفظاً و معناً بشر میں ہے

ہے میری کائنات لبِ خشک وچشم تر
وہ اور کائنات ہے جو بحر و بر میں ہے

صیاد کو یہ دیکھ کے سکتہ نہ ہو کہیں
پرواز کی سکت جو مرے بال و پر میں ہے

دل میں ترازو اور نہ ہو تیر آپ کا
سنجیدگی مزاج کی شاں نظر میں ہے

آنکھیں بڑی بڑی تو ہیں بے شک حضور کی
وسعت بھی دیکھیے تو کہاں تک نظر میں ہے

ہادی وہی مضل بھی وہی ہے تو شیخ جی
اچھے بُرے کی بحث ہی کیوں خیر و شر میں

سمجھو ہدایت اور ضلالت کا اقتضا
کیوں غور و فکر مسئلہ خیر و شر میں ہے

ہادی ہر ایک شکل سے دھوکا ہی کھائے گا
تو اے نظر فریب جب اُس کی نظر میں ہے



رسائی علم و فن کی دُور تک ہے
بشر کی زد میں اب ماہِ فلک ہے

تری باتوں میں کچھ ایسی لچک ہے
مجھے وعدے کی سچائی میں شک ہے

یہ کیسا رُوپ ہے کیسی جھلک ہے
بشر ہی کے بشر ہونے میں شک ہے

نہ ہو پُر لُطف کیوں اُس کی ملاقات
مزہ باتوں میں صورت پر نمک ہے

نہیں گستاخ میرے دیدہ و دل
تمہاری طرح ان میں بھی جھجک ہے

اُسے جس شان میں دیکھا تھا پہلے
تصوّر میں وہ منظر آج تک ہے

نہیں جلوہ تو اُن کا مانعِ دید
مزاحم اپنی پلکوں کی جھپک ہے

تری چبھتی ہوئی نظروں سے سمجھا
مری جانب سے دِل میں کچھ کھٹک ہے

بُرا ہوتا ہے گو دولت کا نشہ
شرافت کا مگر اچھا جھمک ہے

بٹھاتا ہے تری محفل میں یہ دِل
اُٹھاتا ہوں جسے نام اُس کا زک ہے

مجسم نُور ہے جلوہ کِسی کا
سراپا نارِ تجلی کی چمک ہے

نہیں دیتا کسی کا ساتھ کوئی
زیادہ سے زیادہ قبر تک ہے

کِسی پر سوچ کر آتا نہیں دِل
یہ آمد تو اچانک یک بیک ہے

مری فِطرت میں ہے مردم شناسی
مری آنکھوں میں پنہاں مردمک ہے

معمّا ہے عنایت نامہ اُن کا
عِبارت صاف معنیٰ گنجلک ہے

نہو حادی اگر لطفِ تغزّل
غزل پھر اک طعامِ بے نمک ہے



دل متاعِ درد سے معمور ہے
مفلسی میں صاحبِ مقدور ہے

اس کی آنکھوں میں چمک ہے نُور ہے
آدمی کا ہے کو عینِ حور ہے

کس کو اس کی دید کا مقدور ہے
خود وہی ناظر وہی منظور ہے

وہ کسی کو لائے گا خاطر میں کیا
آپ کی نسبت سے جو مغرور ہے

ایک جیسا کب ہے ربطِ حُسن و عشق
کوئی آمر ہے کوئی مامور ہے

تھے کبھی حالات جس کے سازگار
اب وہی حالات سے مجبور ہے

ہو نہ ہو دستور کوئی عشق کا
آپ جو فرمائیں وہ دستور ہے

میرا مطالبہ طلب التفات ہے
گویا ہزار بات کی یہ ایک بات ہے

ناچیز بندہ کیا ہے سمجھنے کی بات ہے
زیرِ تصرف اس کے اگر کائنات ہے

وہ شش جہت ہیں آج اک افسانہ بن گئی
چھ حرفی مختصر جو مری واردات ہے

بے بس ہے تو وہاں وہ جہاں تجھ کو بھول جائے
تو اس کو یاد رکھ یہ ترے بس کی بات ہے

اپنے عمل کے ساتھ بن اُمیدوارِ فضل
تکیہ فقط عمل پہ فریبِ نجات ہے

تھی میری بات کوئی معمہ نہ چیستاں
دانستہ تو نہ سمجھے تو یہ اور بات ہے

جینے پہ لوگ دیتے ہیں ترجیح موت کو
کیا زندگی گریز نظامِ حیات ہے

محروم روشنی سے رہے جس کی زندگی
دن بھی تو اُس غریب کے حق میں رات ہے

تعریفِ شعر اور سہی اہلِ فن کے پاس
حادی سے سن وہ ایک مزے دار بات ہے



مصیبت میں زبانوں پر خدا کا نام آتا ہے
سب اس سے کام لیتے ہیں یہ سب کے کام آتا ہے

زبانِ خلق پر عزّت سے اس کا نام آتا ہے
سمجھ کر بندگیٔ مخلوق کے جو کام آتا ہے

تڑپنا زندگی ہے۔ جتنا جی چاہے مجھے تڑپا
نہ تڑپوں تو سکونِ موت کا الزام آتا ہے

چھپاؤ لاکھ صورت حسنِ صورت چھپ نہیں سکتا
وہ مہ وش بام پر خود ہو کے طشت از بام آتا ہے

لیا کرتے ہیں کام آغاز میں جو دوربینی سے
مجسّم ہو کے اُن کے سامنے انجام آتا ہے

عجب پُر کیف ہوتی ہے نشیلی آنکھ ساقی کی
وہ رشکِ جم ہے جس کے دور میں یہ جام آتا ہے

نظر کس نے چرائی دیدہ و دانستہ محفل میں
کبھو کیا دوستو! خود دوست پر الزام آتا ہے

کھلا مکتوبِ ناکامی ہے یا چہرہ ہے قاصد کا
یہ کیا پیغام لاتا؟ بن کے خود پیغام آتا ہے

اسی نے بر سبیلِ ذکر میرا شغلہ پوچھا
مرے لب پر وظیفہ بن کے جس کا نام آتا ہے

وہ جملے ہیں برت کر لفظِ حاوی مسکراتے ہیں
تو حاوی کو بھی لطفِ صنعتِ ایہام آتا ہے



ایک شعر

میں اس کو چھوڑ دوں یہ گوارا نہیں مجھے
بجلی کی زد میں لاکھ مرا آشیاں رہے



گدازِ عالمِ امکاں سراپا استعارہ ہے
رُخِ گل پر کہیں موتی کہیں پلکوں پہ تارا ہے

ہم اپنے گھر کو کہہ سکتے نہیں اب یہ ہمارا ہے
کسی سے کیا گلہ ہے فطری رواداری نے مارا ہے

تغیر آشنا بن ڈر نہ دنیا کے تغیر سے
گزر جائے گا یہ بہتا ہوا اک تیز دھارا ہے

کوئی سمجھے تو کیا سمجھے کوئی دیکھے تو کیا دیکھے
وہ پوشیدہ نظر سے اور عالم آشکارا ہے

اسی تخریب کی بنیاد پر تعمیر کریں گے
غمِ عالم کے ماروں کو غمِ عالم سہارا ہے

دکھائیں کیوں نہ پھر زعمائے ملت شعبدہ بازی
عمامہ ان کے سر پر اک مداری کا پٹارا ہے

نہیں انکار حاوی مجھ کو اپنی وسعتِ دل کا
مگر یہ دیکھتا ہوں اس میں دنیا کا پسارا ہے



نادیدہ تیری دید کا خواہاں ابھی سے ہے
یہ آرزو تو حشر بہ داماں ابھی سے ہے

بخشش کی ہے جو آس نہ ٹوٹے وہ اے کریم
تیرا گناہ گار پشیماں ابھی سے ہے

سر ہونِ وقت موت ہے۔ بے وقت کام کیا
کیوں تیری زندگی کی نگہ باں ابھی سے ہے

موقوف کیوں بہار پہ ہو رونقِ چمن؟
جانِ بہار! تو جو خراماں ابھی سے ہے؟

جوشِ جنوں میں آئے گا وحشت کے ہاتھ کیا
مفلس ہوں تار تار گریباں ابھی سے ہے

وہ دیکھنے کے بعد کرے گا نثار کیا؟
بے دیکھے جو حضور پہ قرباں ابھی سے ہے

افسانۂ حیات مکمل نہیں ابھی
لیکن یہ اپنا آپ تو عنواں ابھی سے ہے

اس آب و گل میں لطافت نہیں تو پھر کیا ہے
نظر فریب جو صورت نہیں تو پھر کیا ہے

محلّ جلوہ جو صورت نہیں تو پھر کیا ہے
مجازِ عکسِ حقیقت نہیں تو پھر کیا ہے

تمہارا غم تو بہر حال ساتھ ہے میرے
اگر یہ حقِ رفاقت نہیں تو پھر کیا ہے

قیامت آئے گی کل آج ہم غریبوں پر
قدم قدم پہ قیامت نہیں تو پھر کیا ہے

اڑی ہے آنکھ جہاں دل کی خیر کیا مانگوں
وہاں یہ مالِ غنیمت نہیں تو پھر کیا ہے

دوئی کہاں کی نہ تھا وہم غیریت بھی کبھی
جو درمیان یہ صورت نہیں تو پھر کیا ہے

محال کیوں ہو دیدارِ حُسنِ مطلق کا
نظر مقیدِ صورت نہیں تو پھر کیا ہے

جو دیکھتے ہیں مظاہر میں آپ کے جلوے
بصارت اُن کی بصیرت نہیں تو پھر کیا ہے

رہینِ عشق تری شاعری ہے اے حادی
یہ میرے دعوے پہ حجت نہیں تو پھر کیا ہے

پھر تجھ سے ہو سکے تو وہ جلوہ بھی دیکھنا
پہلے نظر کو دیکھ جو حیراں ابھی سے ہے

آنکھیں خدا نے دی ہیں تو یہ دیکھتا ہوں میں
کیا اُس کو دیکھنے کا بھی امکاں ابھی سے ہے

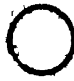
یہ سن، یہ شوخیاں، یہ نگاہوں میں بجلیاں
گویا شباب اس کا نمایاں ابھی سے ہے

حاوی کرے گا تیری شکایت خدا سے کیا
ظالم! اُسے شکایتِ نسیاں ابھی سے ہے



ایک شعر

جاری رہے عمل بھی ترا اس کے ساتھ ساتھ
ہر ایک کام تابعِ عمرِ رواں رہے



دردِ سر مایہ دار ہوتا ہے
یہ مِرا روزگار ہوتا ہے

اُن کا جو راز دار ہوتا ہے
وہ بڑا بُردبار ہوتا ہے

کیا زمانے سے ساز باز کروں
کس کو یہ سازگار ہوتا ہے

ہر خیال اتنا مختلف کہ دماغ
عرصۂ کارزار ہوتا ہے

قطرۂ اشک اپنی پلکوں میں
گوہرِ آب دار ہوتا ہے

مشکلیں ساری ہوتی ہیں آسان
عزم جب استوار ہوتا ہے

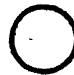
عشقِ صورت ہو حسنِ معنیٰ ہو
فتنۂ روزگار ہوتا ہے

وہ جو چاہیں تو بندۂ مجبور
صاحبِ اختیار ہوتا ہے

صبغۃ اللہ اس کو کہتے ہیں
رنگ جو پائیدار ہوتا ہے

ٹوٹ جاتی ہے جب ہر اک اُمید
تُو ہی پروردگار ہوتا ہے

جو بھی ہو ترجمانِ حق حادی
قابلِ اعتبار ہوتا ہے



ایک شعر

حادی بدل گیا بہت الفاظ کا محل
اب وہ زباں رہی نہ وہ اہلِ زباں رہے



ہر آنسو آنکھ میں دل کا لہو ہے
نہ سمجھو بھی تو عاشق سُرخ رو ہے

کبھی تھی دل میں ارمانوں کی ہل چل
اب اِس بستی میں سنّاٹا ہے ہو ہے

کسی صورت بھی جو دل سے نہ نکلے
اُسی کا نام شاید آرزو ہے

رہیں گے بلبلوں سے متفق کیا
گلوں میں اختلافِ رنگ و بو ہے

نہیں تیرا تصور عینِ صورت
تو پھر کیوں دیکھنے میں ہو بہو ہے

نہ رکھ اُلٹا قدم اے آبلہ پا
ہر اک پہلو سے سیدھا گوکھرو ہے

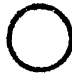
خلا دشوار ثابت کرنے والو
غریبوں کے تو معدے میں خلو ہے

اثاثہ اور بھر دل کا اثاثہ
اُمید ۔ ارمان ۔ حسرت آرزو ہے

نہ جانے کتنے آنسو پی چکا ہوں
جو ہم چشموں میں اتنی آبرو ہے

دُھلا دیتے ہیں منہ اشکِ ندامت
مری توبہ بہ عنوانِ وضو ہے

کہوں کیا موت ہو یا رزق حاوی
بہانہ ساز وہ، یہ حیلہ جو ہے



ایک شعر

کیا ربط ہے یہی تو معمہ ہے حل طلب
سرکار کے وجود کو میرے عدم کے ساتھ

یہاں جو موجب سود و زیاں ہے
وہ میرا دل ہے وہ میری زباں ہے

یہ کیسا کالبد کون و مکاں ہے
جہاں انسان ہی روحِ رواں ہے

برائے نفس ہے پہرہ نَفَس کا
یہ گویا سنتری ہے پاسباں ہے

زباں پر دل ہو تو چھپتی نہیں بات
کہوں کیا دل کے قابو میں زباں ہے

ہے مشتِ خاک کی رفعت کچھ ایسی
زمیں پر سرنگوں خود آسماں ہے

کَنَفسٍ واحدہ خلقت ہے سب کی
ہماری جان ہی جانِ جہاں ہے

یہ دردِ محن بھی دارِ محن بھی!
زمانے کی ہر آفت امتحاں ہے

وہاں سر افگنی ہے سربلندی
فرازِ عرش جن کا آستاں ہے

زمانے کی ہے سب کو چاہ لیکن
سہ ہسا سوں کے لئے اندھا کنواں ہے

ہے جب اتمامِ حجت لن ترانی
کلیم اللہ کا کیوں ہم زباں ہے

ترے قدموں کو ہو جائے نہ لغزش
امانت سر پہ اک بارِ گراں ہے

یہ استغنائے دل یہ بے نیازی
مکیں جیسا ہے ویسا ہی مکاں ہے

من و تو میں کھلے کیا سرِ وحدت
ضمائر کا تغیر درمیاں ہے

اَرِحْنِیْ یا بلالؓ! اللہ اکبر
یہ کیسا اِذن ہے کیسی اذاں ہے

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک
قفس پر آشیانے کا گماں ہے

بساطِ دل ہے شایانِ تجلّی
مکاں کہتے ہیں جس کو لامکاں ہے

مٹانے سے جو کرتی ہے ترقی
وہ ہندوستان کی اُردو زباں ہے

نہ پوچھو کائنات شعرِ حاوی
ہمہ استادانہ انداز بیاں ہے

یہ تو سمجھو جو تم پہ مرتا ہے
وہ کہیں موت سے بھی ڈرتا ہے

کب وہ اس کا لحاظ کرتا ہے
کون کیسا ہے کس پہ مرتا ہے

ذکر میرا عدو جو کرتا ہے
کچھ نہ کچھ اس کے کان بھرتا ہے

دل کہاں عشق میں مآل اندیش
اس کو جو سوجھتی ہے کرتا ہے

اس کو غصہ دلا کے دیکھ لیا
رنگ چہرے کا کیا نکھرتا ہے

دُھن کا اپنی ہے بات کا پورا
وہ جو کہتا ہے کر گزرتا ہے

کیوں غمِ عشق میں کمی ہو گی!
کہیں تیرا دیا بھی سرتا ہے؟

کیا تصنّع بھی ہے کوئی زیور
وہ تو بنتا نہیں سنورتا ہے

ہم ہیں پامالِ دوست اے حاؔدی
کون اس راہ سے گزرتا ہے

ہمارے حال پر کیوں آج اُن کی مہربانی ہے
اگر کچھ مصلحت بھی ہے تو کوئی چھیڑ خوانی ہے

حسینوں پہ جنابِ شیخ کی بھی مہربانی ہے
زلیخا کی طرح ان کو بڑھاپے میں جوانی ہے

سُنا دشمن سے پھر سُن کر بھی دل چُپ جو لی تو نے
تو میرا ذکر کیا، ناول ہے قصہ ہے کہانی ہے

یہ ہمارے ملنے والے آپکی قسمت سے ملتے ہیں
کوئی رشکِ ارسطو ہے کوئی بقراط ثانی ہے

یہ کس کے ڈر سے دزدیدہ نگاہی آپ نے سیکھی
یہ کس کے خوف سے چوری چھُپی کی دلستانی ہے

اگرچہ شعر میں جذبات کا اظہار ہوتا ہے
مگر وہ بات منہ سے کیوں کہیں جو دل میں ٹھانی ہے

تم اپنی خیر خواہی حضرتِ دل طاق پر رکھو
حسینوں سے تو حُسنِ ظن بھی رکھنا مہربانی ہے

خُدا جانے مئے گلرنگ کیا کیا رنگ لائے گی
الٰہی خیر ہو پہلے ہی چہرہ ارغوانی ہے

تم اُس کے نام پر کیوں دیدے نیلے پیلے کرتے ہو
تمہارے حق میں کیا حاوی بلائے آسمانی ہے

اگلے دیکھئے تلیما



اپنی نگاہ دوست کی صورت نگر تو ہے
اس کی نظر اِدھر نہ سہی رُخ اِدھر تو ہے

دشمن سے کی ہے ہم نے جو دانستہ دوستی
مانا یہ کارِ خیر نہیں، رفعِ شر تو ہے

خود سر نہیں ہے چاہنے والا حضور کا
لیکن خطا معاف وہ شوریدہ سر تو ہے

کیا غم ہے زندگی جو مری معتبر نہیں
ہو تیرے غم کی خیر کہ یہ معتبر تو ہے

تو خود نظر نہ آئے تو اس کا تصور کیا
امیدوارِ جلوہ سراپا نظر تو ہے

سجدوں سے کام ہے تجھے جب اے جبینِ شوق
ان کے قدم نصیب نہیں سنگِ در تو ہے

آگے نظر بڑھی نہ تری جلوہ گاہ سے
یہ میری چشمِ شوق کی مدِّ نظر تو ہے

دل میرا ہے بھی یا نہیں اپنے مقام پر
جس کی دوا ہیں آپ وہ دردِ جگر تو ہے

اُٹھتے ہیں جب قدم تو رکھو دیکھ بھال کے
دنیا قیام گاہ نہیں رہ گزر تو ہے

حاوی کسی سے قدر کی اُمید کیوں رکھے
اندازِ فکرِ شعر بہ قدرِ ہنر تو ہے

الٰہی خیر ہو کچھ اور ہی وحشت کا ساماں ہے
جنوں کے ہاتھ اب تو عصمتِ جیب و گریباں ہے

پسِ مردن بھی مرقد پر ہجوم یاس و حرماں ہے
سرہانے بیکسی روتی ہے حسرت فاتحہ خواں ہے

جنوں کی ہم سے پھر کس طرح خاطر داریاں ہوں گی
نہ یہ دامن سلامت ہے نہ ثابت یہ گریباں ہے

بڑی خوبی سے آئینہ میں رکھا ہے مصور نے
تری تصویر بھی میری طرح ششدر ہے حیراں ہے

یہ ہم نے "اک نہ شد دو شد" کا مطلب عشق میں سمجھا
حقیقت میں کسی کو دل کا دینا آفتِ جاں ہے

میں اپنے دل میں فرحت اور وحشت دونوں پاتا ہوں
گلستاں کا گلستاں ہے بیاباں کا بیاباں ہے

کوئی آشفتہ خاطر کوئی وحشی کوئی سودائی
ترے گیسو پریشاں کیا ہیں اک عالم پریشاں ہے

یہ آنکھیں یہ ادائیں یہ نگاہیں۔ آئینہ دیکھو!
نکل سکتا نہیں کچھ منہ سے حاوی ایسا حیراں ہے

میں کیا بتاؤں کس لیئے دل بیقرار ہے
یہ بدنصیب آپ کا اُمیدوار ہے

پابندِ وضع ہے جو ترا بے قرار ہے
اب تو خیال رکھ کہ نہ رکھ اختیار ہے

میں اور کیا بیان کروں قصّہ مختصر
اس کے جفا کی حد نہ ستم کا شُمار ہے

سب سے غرض ہے تم کو ہمیں سے غرض نہیں
دنیا جہاں سے عار نہیں ہم سے عار ہے

دل سے مرے خلش نہیں جاتی رقیب کی
گویا چمن میں پھول سے وابستہ خار ہے

آنکھیں بھی راہ تکتی ہیں کس ذوق و شوق سے
ظالم بڑے مزے کا ترا انتظار ہے

گر بے گناہ خون کسی کا نہیں ہوا
پھر کس لیے نگاہ تری شرمسار ہے

میں وہ کہ اپنے دل پہ کبھی قابو نہیں مرا
تو وہ، زمانے بھر پہ ترا اختیار ہے

حاوی جگر پہ زخم لگا ہے تو شادہوں
سب کی خزاں جو ہے وہی میری بہار ہے



دلِ ستم زدہ پھر کیوں نہ مشکلوں میں رہے
جب اُن کی ایک تمنا کئی دلوں میں رہے

کسی کی تازہ دم آہیں کہیں ٹھہرتی ہیں
تھکا ہوا ہو مسافر تو منزلوں میں رہے

نگاہِ شوق کو ہے ذوق بے حجابی میں
وہ حسن کیا ہے جو پردوں میں محملوں میں رہے

زباں پہ آنے کی جو بات ہو زباں پہ آئے
دلوں میں رہنے کی جو چیز ہو دلوں میں رہے

زمانے میں کوئی تجھ سا نہ بے مروت ہو
خدا کرے کہ ذرا تیل ان تلوں میں رہے

نہیں زمانے میں راحت کسی کو اے حاوی
غزل کا قافیہ پھر کیوں نہ مشکلوں میں رہے



تجھے کب اپنا جورِ ناروا معلوم ہوتا ہے
کسی کو بھی کہیں اپنا کیا معلوم ہوتا ہے

کھلی چٹھی کا مطلب تو کھلا معلوم ہوتا ہے
پھر اس پہ نامہ بر لکھا پڑا معلوم ہوتا ہے

سمجھتے تھے جسے ناآشنا دردِ محبت سے
وہی دل آج عالم آشنا معلوم ہوتا ہے

مری باتوں کو سن کر خار کھاتا ہے عدو شاید
کہ ہر فقرہ مرا چبھتا ہوا معلوم ہوتا ہے

ہے کٹھ پتلی ہر اک انسان اپنے دل کے ہاتھوں سے
جسے ہم دیکھتے ہیں من چلا معلوم ہوتا ہے

نہیں رہتی کوئی راحت ہمیشہ جاگزیں دل میں
نہ کوئی رنج اس میں دیرپا معلوم ہوتا ہے

بھلا دیتا ہے درسِ عشق سب ادراک عاشق کا
کہ اس مکتب میں ہر معلوم نامعلوم ہوتا ہے

تری شانِ تغافل دیکھ کے قائل تو تھے لیکن
اب اپنا ظرف اپنا حوصلہ معلوم ہوتا ہے

تجھے ہے ناز اپنی عقل و دانش پہ مگر ہادی
عدو بھی تو بلا کا چھپا کٹا معلوم ہوتا ہے



قلم کی کچھ نہیں ریشہ دوانی
دلی جذبات کی ہے ترجمانی

نہوں جذبات جب تک کار فرما
دکھائے کیا کوئی معجز بیانی

زبانِ خامہ سے ہوتی ہے ظاہر
دہی شئے دل میں شاعر نے جو ٹھانی

بگڑتا بھی نہیں کچھ شاعری میں
کہ جمع و خرچ ہوتا ہے زبانی

ہنر ثابت کرے وہ عیب کو بھی
اُسے آتی ہیں وہ باتیں بنانی

کبھی موضوع کو مہمل بنا دے
کبھی مہمل کو کردے بامعانی

وہاں کھینچے وہ رنگا رنگ نقشے
جہاں عاجز ہوں بہزاد اور مانی

وہ مشکل قافیوں کو بھی بہا دے
ہے فنِ شعر اُس کے حق میں پانی

وہ خشک اور بے مزہ مضموں میں بھی
کھِلا دے ایک گلزارِ معانی

بہر صورت کوئی بھی مسئلہ ہو
نہیں رُکتی طبیعت کی روانی

بھلا حادیؔ کہاں تک وصفِ شاعر
پھر اُس پر طرفہ اپنی ہی زبانی

سُخن گوئی میں اپنے آپ کو کیا
سمجھتا ہے کمالِ اصفہانی

یہ کیسی خود ستائی کی علامت؟
یہ کیسی خود فریبی کی نشانی؟





ہے جس کے حال پر بھی عنایت حضورؐ کی
پرسش خطا کی ہے نہ سزا ہے قصور کی

منصور کو ملی تھی سزا اس قصور کی
کھو کر شعور بات نہ کھوئی شعور کی

آرام کر رہے ہیں ترے کشتگانِ ناز
چونکا نہ دے انھیں کہیں آواز صور کی

دنیائے حُسن و عشق میں ہے کون سی مثال
ان کے غرور اور ہمارے قصور کی

کیوں داستانِ طور پہ ہیں لن ترانیاں
چوٹی کی بات ایک تجلی تھی نور کی

سمع قبول چاہیے جیسا نہیں نصیب
ہوتی ہے کیا ضمیر کی آواز دُور کی

یا تو نظر کو دیتی ہیں یہ صورتیں فریب
یا ہو گئی خراب نظر اپنی دُور کی

ہے اُن کی آنکھ کا بھی تو سرمہ بنا ہوا
قسمت چمک اٹھی جو تجلی سے طور کی

تیرا نیاز مند ہے دُنیا سے بے نیاز
تہمت لگائی جاتی ہے اِس پر غرور کی

یہ صورتیں ہی مظہرِ حُسن و جمال ہیں
بے صورتی نہیں کوئی صورت ظہور کی

حاوی قریب تر ہیں وہ حبل الورید سے
لیکن سمجھنے میں ہے ذرا بات دُور کی

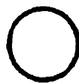


فارسی غزل[1]

منزلِ گیسوئے مسکینش کنارِ دامن است
طالعِ دامن بلند است و بکارِ دامن است

مایۂ صد سرفرازی! سر بہ سودا داشتن
چاک بود از جنوں صد افتخارِ دامن است

من کہ از فیضِ سحابِ غم گلستاں دربرم
گریہ ہائے خوں چکانم لالہ زارِ دامن است



---

[1] استادی حضرت حاوی مغفور کا فارسی کلام دستیاب نہ ہو سکا میرے ہاں موجود مسودہ میں صرف ۳ شعر دستیاب ہوئے جو ناظرین کی نذر ہیں۔ (اخگر)

متفرقات

متفرقات

قادری چمن[1]

ہم قادری ہمارا چمن قادری چمن
اپنا مکان اپنا وطن قادری چمن

صد در دکشِ بہارِ گلستانِ یک جہاں
لاکھوں چمن کا ایک چمن قادری چمن

جیتے ہیں ہم یہاں تو کہاں مر کے جائیں گے
ہوگا ترے سپرد یہ تن قادری چمن

تیری ذرا سی سیر نے سب کچھ بھلا دیا
اے غیرتِ نعیم و عدن قادری چمن

آرام کر رہے ہیں یہاں سیدالشیوخ
ہے فخرِ سر زمینِ دکن قادری چمن

حادی یہاں کی آب ہوا کا اثر نہ پوچھ
کھوتا ہے دل سے رنج و محن قادری چمن

[1] حضرت حادی کی آخری آرام گاہ

نذرِ عقیدت

بہ مسرت شادی صاحبزادۂ پیرو مرشد حضرت سید محمد بادشاہ حسینی قادری

للہ الحمد آج ہے اُن کا بیاہ
پیرو مرشد کے ہیں جو نورِ نگاہ

مرحبا یہ مجلسِ عیش و سرور
حبذا یہ شام رشکِ صد پگاہ

دیدنی ہیں انجمن آرائیاں
اور جو دیکھو تو ہو خیرہ نگاہ

مسند زرتار پر ہے جلوہ گر
نوشۂ ذی شان با صد عز و جاہ

آج یوں ہے جلوہ افروزِ نظر
جس طرح افلاک پہ ہوں مہر و ماہ

ہار پھولوں کے گلے کا ہار ہیں
حسب آئین و رواج و رسم و راہ

جمع ہیں نوشاہ کے سارے عزیز
جن میں سب عظمت مآب و دیں پناہ

مجمع احباب بھی ہے گرد و پیش
خوش خصال و خیر جو یا خیر خواہ

عقدِ مسعود و ہمایوں جب ہوا
ہو گئے جن جن کو ہونا تھا گواہ !

جب ہوئی تکمیلِ ایجاب و قبول
ہو چکے سارے مراسم سربراہ

کشتیاں بادام مصری کی لُٹیں
فرق نوشہ پر بصد انداز حیاہ

لوٹنے والوں کی بَر آئی مُراد
بیٹھ کر جو دیر سے تکتے تھے راہ

پھر تو کیا تھا ہر طرف تھی ریل پیل
محفل شادی بنی جولان گاہ

ایک پر اک ٹوٹ کر گرنے لگے
لوٹنے والے پھر اللہ کی پناہ

کشمکش کا اک طرف دلچسپ سین
اک طرف بچوں پہ غصے کی نگاہ

کوئی عمامے کو لیتا تھا سنبھال
تھام لیتا تھا کوئی اپنی کلاہ

الغرض جب کم ہوئی یہ دھوم دھام
ہوگئی گو نہ جو آسائشِ رفاہ

پھر نکالی شاعروں نے وہ سبیل
کہنے کی حد تک نہیں جس کی پناہ

تھی خوشی لکھ کر سنانے کی جسے
آج پوری ہوگئی سب اشتیاہ

پڑھ رہا ہے کوئی نظم تہنیت
جس کے ہر اک شعر پہ ہے واہ واہ

پیش کرتا ہے کوئی تاریخ عقد
ہے ہر اک صنفِ سخن آماجگاہ

شعر کہنے کی ہے کچھ یوں ہی سی مشق
اور وہ بھی خال خال دگاہ گاہ!

میں نے اظہارِ عقیدت کے لیے
لکھ لیے کچھ شعر حسب دستگاہ

پیر میخانہ کے گھر تقریب ہے
آج مے خوارو نہ پینا ہے گناہ

بے مے و ساغر ہی متوالے بنو
رشکِ جامِ جم ہے ساقی کی نگاہ

کون ساقی نام حاوی سے سنو
حضرت سید محمد بادشاہ

اُن کا سایہ سر پہ ہو نوشاہ کے
تا ابد دایم الٰہی دیرگاہ !!

خوش رہیں ہر آن نوشاہ و عروس
خوب دونوں میں ہو اُلفت اور چاہ

ہر مسرت ان کی ہو ادنیٰ کنیز
ہر طرب خادم بنے شام و پگاہ



قصیدہ تہنیت

کیا بتاؤں جو تھی اک روز مری کیفیت
تھا میں بیدار نہ کچھ خواب کی سی تھی حالت

اس کو کہتے نہیں بیداری ہو یا مدہوشی
قوم کا اس پہ ہے اطلاق نہ کامل یقظت

ہے بجا اس کو اگر کوئی سمجھ لے خُلسیہ
ہے دُرست اس کو اگر کوئی بتائے غیبت

یا کوئی صاحب دل سمجھے اسے استغراق
یا کوئی صاحب شکر اس کو کہے محویت

الغرض دیکھتا کیا ہوں میں اسی عالم میں
ہے مرے سامنے اک پیکر نورانیت

بدر رخسار و ہلال ابرو و ناہید جبیں
مشتری صورت و خورشید خد و مہ طلعت

لالہ رو، سیم تن و گل بدن و غنچہ دہن
سرو بالا، و صنوبر قد و طوبےٰ قامت

اُس کے عارض سے عیاں مہر جہاں تاب کی ضو
اس کی صورت سے نمایاں ہے خدا کی قدرت

زُلف پر پیچ ہے صد غالیہ طبلۂ عُود
جعد پر تاب ہے صد نافۂ مُشک تبت

دیکھنا عارض و گیسو کہ نظر آتے ہیں
باہم اک وقت میں روز و شب و نور و ظلمت

حُسن دُنیا میں عجب چیز ہے اللہ اللہ
جس میں ہوتی ہے بلا کی کشش و جذبیت

اہلِ تحقیق سمجھتے ہیں اِسے نسبت خاص
ہے جو میلان طبیعت کی حقیقی علّت

جس کسی میں بھی نظر آئے گا اس کا جلوہ
نفس انسانی کو ہو جائے گی اس سے رغبت

یہی نسبت ہو جو موجود میان ملکات
تو عدالت اِسے کہتے ہیں سب اہلِ حکمت

اعتدال اس کو سمجھتے ہیں اطبا سارے
متمکن ہو عناصر میں اگر یہ نسبت

ہو جو نغمے میں تو ابعادِ شریفہ کہیئے
جس کے سُننے سے ہو کانوں کو میسر لذت

یہی خوبی نظر آ جائے جو مابین کلام
نام سے ہو گی بلاغت کے پھر اسکی شہرت

یہی نسبت ہو جو اعضاء و جوارح کو حصول
دوسرے لفظوں میں کہلائے یہ حسنِ صورت

غمزہ و عشوہ و انداز و ادا کہتے ہیں
دیکھ کر سب اسی نسبت کو میاں حرکت

قصہ کوتاہ وہی گل بدن و غنچہ دہن
حور عین چشم و پری صورت و انساں سیرت

تھی میرے آگے اکہوں کیا میں اب اسکے آگے
اُڑ گئے ہوش مرے۔ بڑھ گئی میری حیرت

رہ گئی ایک سراسیمگی و حیرانی
ہو گئے عقل و خرد فہم و ذکا سب رخصت

رفتہ رفتہ جو ہوئی رفع میری مدہوشی
پھر بتدریج ہوئی ٹھیک جو میری حالت

آتے آتے مرے سب آئے جو گم گشتہ حواس
ہوتے ہوتے ہوئی پیدا جو تکلم کی سکت

میں نے رُکتے ہوئے پوچھا کہ ترا نام ہے کیا
اے گل تازۂ نورستۂ باغ جنت!

ہنس کے بولی کہ تعارف کی نہیں ہوں محتاج
آج دنیا میں ہے مشہور مری شخصیت

میں ہوں شادی ہے شریعت میں مرا نام نکاح
میرے محتاج ہیں کل سب کو ہے مری حاجت

بیاہ کے نام سے کرتا ہے کوئی یاد مجھے
کہیں تدبیر منازل سے ہے میری شہرت

کدخدائی سے ہوں موسوم کسی کے نزدیک
خانہ آبادی ہے مشہور میرا اسم صفت

ہے مری ذات پہ بہبودیٔ دنیا کا مدار
میری ہستی پہ ہے موقوف نشاط و عشرت

میرے ہی جلوے سے ہے آج زمانہ روشن
میرے ہی دم سے ہے عالم کی یہ زیب و زینت

شاہ سے تا بہ گدا سب ہیں پرستار مرے
میری ہر ملک میں ہر قوم میں ہے آؤ بھگت

نصِ قرآنی سے ثابت ہے ضرورت میری
دیکھئے، فانکحوا ما طاب لکم الآیت

نہیں کرسکتے مسلماں کبھی مجھ سے اعراض
کہ ہے ارشادِ نبیؐ من رغبت عن سنت

مسکراتے ہوئے پھر اُس نے کیا مجھ سے خطاب
نیند سے جاگ کہ اب جاگی ہے تیری قسمت

دیکھ! نوشاہ بنے مولوی عبدالباقی
جن کی شادی کی زمانے سے تجھے تھی حسرت

ہاں سنا مدحتِ نوشاہ میں قصیدہ کوئی
ہے اگر متبع ذوق علیہ الرحمت

میں نے سنتے ہی کہا اے ترے جلوے روشن
تو نے کیا آج سنائی ہے نوید بہجت

وہ ہیں نوشاہ تو پھر کیوں نہ قصیدہ لکھوں
کیوں دکھاتے نہ مری طبع پھر اپنی جودت

ان کی شادی ہے جو ہیں مظہر اسرار علوم
ان کی شادی ہے جو ہیں مصدر حلم و رافت

حزب شطاریہ کے آج جو ہیں فرد فرید
اور پھر سید کونین کی ہیں ذریت

ان کے اسلاف تھے سب شیخ شیوخ و علماء
ان کے اجداد تھے سب راہ نمائے ملت

علم معقول میں ان کو ید طولیٰ ہے نصیب
اور منقول پہ حاصل انہیں کافی قدرت

عالم و فاضل و کامل ہیں وہ اپنے فن کے
باوجود اس کے ذرا بھی نہیں کبر و نخوت

اجتہاد ایسا کہ ہر مسئلے میں صاحب رائے
اور ہر رائے کو ہوتی ہے خطا سے عصمت

چشمِ بد دور ہے تدریس میں ایسا اعجاز
اک غبی کو بھی بنا دیں وہ فلاطوں فطنت

منع وارد جو وہ فرمائیں کسی مسئلے میں
نہ چلے پھر تو ارسطو کی بھی کوئی حجت

علم کا ایک سمندر ہیں بوقتِ تقریر
اور تقریر میں ہے سحر کی سی خاصیت

نہیں تحریر بھی کچھ آپ کی تقریر سے کم
دیکھنے سے جسے ظاہر ہو نظر کی وسعت

آپ کی فکرِ رسا حلِ دقائق کی کلید
آپ کا ذہن صفا کوہ شگافِ دقت

آپ کی ذات میں کیوں جمع نہ ہو خیرِ کثیر
صادق آیا ہے یہیں آیۂ یؤتی الحکمت

آپ کے اور ہوں کیا اس سے زیادہ اعزاز
ہے حدیثِ نبوی العلماء ورثت

طلبِ علم فریضہ ہے ہر اک مسلم کا
اس سے انکار کرے کوئی کہاں یہ طاقت

آج تک آپ اسی فرض کو کرتے تھے ادا
یعنی گزری ہے اسی شغل میں ہر اک ساعت

جب ہوئی السنہ مشرقیہ کی تکمیل
امتحانات سے جب آپ نے پائی فرصت
پھر تو شادی کی یہ طے پائی مبارک تقریب
فرض کے ساتھ ادا ہوگئی گویا سنت
زندگی کا یہ شریک آپ نے موزوں پایا
افتخار نسب وذی حسب ذی عفت
نونہال چمن مصطفوی وہ بھی ہیں
دودمانِ نبوی سے ہے انھیں بھی نسبت
خوش وخرم رہیں یارب یہ عروس دلو شاہ
شامل حال رہے دونوں کے خیر وبرکت
ان پہ ہر دم ہو تری نکہتہ نوازی ایسی
کہ ہر اک زحمت بے جا ہو سراپا رحمت
رات دن ان کو میسر رہے خاطر جمعی
روز وشب ٹھوکروں میں ان کی ہو مال و دولت
ان کی ہر ایک تمنائے دلی پوری ہو
بخت کو اوج مقدر کو عطا ہو رفعت
دامن عیش پہ آئے نہ کبھی گرد ملال
چھائے عشرت کی فضا پر نہ غبار کلفت

متمنی ہوں کہ ہو جائے مشرف بہ قبول
پیش کش ہے جو یہ حادی کی دلی تہنیت

نوٹ: یہ قصیدہ مولوی عبدالباقی شطاری کی شادی کے موقع پر پیش کیا گیا تھا۔



سرچڑھ کے تیرے شاد ہوئے بحر و بر میں پھول
کیوں خار سے نہ کھٹکیں عدو کی نظر میں پھول

شادی ہے یہ بلالِ خوش اقبال کی جو آج
ہنستے ہیں کھِل کھِلا کے ہر اک تارِ زر میں پھول

سر چڑھنے کی اُمید جو کل رات سے ہوئی
کلیاں تمام کھِل کے بنیں رات بھر میں پھول

تو اور تیرے قد پہ یہ سہرا خُدا کی شان
دیکھے نہیں ہیں ایسے کسی بھی شجر میں پھول

ہر ایک دل شگفتہ ہے مارے خوشی کے آج
نوشاہ اور عروس ہیں سب کی نظر میں پھول

ہر ایک نقشِ پا گُلِ باغِ مُراد ہیں
کیسے بچھے ہوئے ہیں تری رہ گزر میں پھول

ہیں پھول تیرے سہرے کے مرغوبِ دو جہاں
چشمِ فلک میں تارے ہیں چشمِ بشر میں پھول

جذباتِ ستائش

رباعی حضرتِ امجد کی مرغوب صنفِ سخن تھی، اس لیے ان کی ستائش میں تقلیداً اسی صنف کو اختیار کیا گیا (حادی)

اردو میں نہیں حضرتِ امجد کی مثال
حاصل تھا رباعی میں خدا داد کمال
پایا ہے اسی صنف کو میں نے موزوں
آیا جو مجھے اُن کی ستائش کا خیال

زبان اور بیان کی خوبی

شیریں ہے زباں اور بیاں ہے رنگیں
ہر لفظ ہے یوں جیسے انگوٹھی میں نگیں
امجد کی رباعی ہے رُباعی حادی
اُٹھتا ہے چو طرف سے شورِ تحسیں

رباعی گوئی میں مقام

سرمد کا ہم نوا سخن ور کہیے
یا صوفیِ باصفا قلندر کہیے
اعجازِ سخن کا ہے تقاضہ حادی
امجد کو رباعی کا پیمبر کہیے

اسرار و معارف کا خزینہ ہے کلام
پاکیزہ مضامیں ہیں گویا الہام
امجد کی ضرورت تھی دکن کو لیکن
دنیا سے چل بسا دکن کا خیام

اختصار وایجاز کا کمال

اظہارِ حقیقت ہے بہ عنوانِ مجاز
تا عرش ہے امجد کے سخن کی پرواز
الفاظ ہیں کوزہ، تو معانی دریا
ایجاز کی صنعت میں ہے شانِ اعجاز

تحریر میں واردات آجاتی ہے
سُنیے تو سمجھ میں بات آجاتی ہے
امجد کی رُباعی کی کروں کیا تعریف
دو بیت میں کائنات آجاتی ہے

اردو زبان پر احسان

امجد ہی کا حصّہ ہے یہ تاثیرِ مقال
لیتا ہے مزے قال کے ہر صاحبِ حال
ہیں بیش بہا ایسے جواہر پارے
اردو کی رُباعی ہوگئی مالا مال

آخر میں ممدوح سے خطاب

قائم ہے ترے وصف میں حاوی کی زباں
ہے تیرا کلام ترجمانِ قرآں
دنیا کو دیا ہے درسِ حکمت تونے
اے سعدیٔ وقت و بوسعیدِ دوراں



امام القراء حضرت قاری میر روشن علی کی
گولڈن جوبلی کے موقع پر خراجِ شعری

ہے مُسلّم فضیلتِ تجوید
اس کا موضوع ہے کلامِ مجید

جاننا اس کا سب پہ لازم ہے
جس کی قرآن میں بھی ہے تاکید

حافظوں کو ہے احتیاج اس کی
ناظروں کو ضرورت اس کی شدید

نہ مخارج بغیر اس کے بجا
نہ تلاوت بغیر اس کے مفید

الغرض ہے جو اس کی اہمیت
جانتے ہیں وہ فارغ التجوید

ق

وعدہ قرآن کی حفاظت کا
جس پہ ناطق ہے خود کلامِ مجید

اس کی آواز بھی تو ہے محفوظ
الغرض الغرض غیب کی تائید

قاریانِ کلامِ ربانی
عالمانِ دقائقِ تجوید

کر رہے ہیں حفاظتِ اصوات
ان سے سنئے ذرا کلامِ مجید

عہدِ نبوی سے دورِ حاضر تک
ہے معنعن بجنسہٖ تقلید

لطفِ قرأت نہ پوچھیے کیا ہے
ذوقِ ایمان کی ہوتی ہے تجدید

سچ تو یہ ہے کہ کیا بیان کرے
مجھ سا ناواقفِ فنِ تجوید

جانتا ہو جو مد کو زلفِ دراز
شانہ سمجھے جو دیکھ لے تشدید

کیا لکھے کس طرح لکھے آخر
خامہ حیران ہے دمِ تسوید

پائے کیا طبعِ نارسا جودت
کیا دکھائے کمالِ ذہن بلید

شاعروں سے الگ ہوں میں ایسا
شعر ہیں جیسے صنعتِ تجرید

نہ تو ہیں انوری و خاقانی
نہ فرزدق، نہ بحتری، نہ لبید

کالے کر لیتا ہوں کبھی اوراق
بس یہی ہیں مرے سیاہ و سفید

سنیے اب کس سے ہے خطاب مرا
کس کی خاطر تھی اس قدر تمہید

کس کو کہتے ہیں سب مجددِ فن
کس کے شاگرد سب کے سب ہیں رشید

وقف کی کس نے زندگی اپنی
کس نے کی اتنی خدمتِ تجوید

شیخ تجوید کون ہے ایسا
کس کی شہرت ہے اب قریب و بعید

کس کے وردِ زباں کلام اللہ
مشغلہ کس کا قراءت و تجوید

آج کس کی نظیر ہے معدوم
آج کس کی مثال ہے ناپید

نام کیا لوں کہ نام "روشن" ہے
جس کو حاصل ہے شہرتِ جاوید

قاریانِ دکن کے ہیں استاد
اپنے فن میں ہیں آپ فردِ فرید

درس و تدریس میں نہیں شامل
کوئی گفتار جز کلامِ مجید

آپ بے شبہ ہیں وحید العصر
اس پہ اجماع ہے بلا تردید

سیکڑوں آپ کے طفیل سے بنے
مستند قاریٔ کلامِ مجید

آپ کے ہیں تلامذہ جتنے
خواہ ان میں قدیم ہوں کہ جدید

یوں ضیا بار ہیں زمانے میں
جس طرح چرخ پر مہ و خورشید

آپ پر کیوں دکن کو ناز نہ ہو
اِنَّكَ مِنْ آئِمَّةِ التَّجْوِیْد

استفادہ ابھی کرے دُنیا
عمر میں ہو ترقی اور مزید

ختم کر اپنی نظم کو حاوی
کہ ہے طولِ کلام غیر مُفید



تین شعر

زاہد ہے سجدہ ریز تمنّا میں حور کی
ایسے بھی لوگ رکھتے ہیں نیت فتور کی

مردود ہے وہ جس میں غرورِ خودی رہے
ابلیس پا چکا ہے سزا اِس قصور کی

دیکھو ذواتِ خلق میں خالق کی ذات ہے
سرمایہ دار بن گئی ظُلمت بھی نُور کی

قطعہ تہنیت و تبریک بہ خدمت "بابائے اردو"

مولوی عبد الحق

سرور و کیفِ اردو کچھ نہ پوچھو
غضب ہے نشۂ صہبائے اردو

زبانیں بھی ہیں لذت گیر اس سے
سروں میں ہی نہیں سودائے اردو

ہوا ہندوستان پورا معطر
جو پھیلی نکہتِ گل ہائے اردو

یہ اب کانِ ادب۔ جانِ ادب ہے
بلاغت خیز ہے انشائے اردو

سبھی ہیں کوئی ناظم ہو کہ ناثر
اسیرِ گیسوئے لیلائے اردو

جو پوچھو۔ ہے قبولِ عام کس کو
تو فوراً ہی زباں پر آئے اردو

ہمہ گیری، پذیرائی ہے اس میں
نہ پالوں پہ نہ کیوں چھا جائے اردو

بٹھانا چاہے کوئی لاکھ اس کو
تو کیا ممکن بھی ہے بیٹھ جائے اردو

وہ خود دن رات اردو بولتے ہیں
یہ ہے مجبوریٔ اعدائے اردو

مخاطب اب میں تجھ کو کر رہا ہوں
سُن اے وارفتہ و شیدائے اردو

کیا اردو کا تو نے بول بالا!
تجھے کہتے ہیں سب "بابائے اردو"

بنائے انجمن ڈالی ہے تو نے
ترقی پہ ہے کیوں انشائے اردو

تری ہستی بھی خود اک انجمن ہے
جو تو ہے انجمن آرائے اردو

تری خدمات کے سب معترف ہیں
تری ممنون ہے دُنیائے اردو

[۹۰] ویں یہ بہارِ عمر تجھ کو
مبارک اے کرم فرمائے اردو

نہیں ہے ایک ہادیؔ ہی ثنا خواں
ترا شیدا ہے ہر شیدائے اُردو

قطعۂ تاریخ بہ تقریب تسمیہ برخوردار مصطفیٰ حسین

فرزندِ عزیزی شیخ حسین صاحب مُشتاق

منتظم اے جی آفس حکومت آندھرا پردیش (حیدرآباد)

میں اُن بچوں کی گویائی پہ صدقے ؛ ہو پہلی وحی پہلے جن کے لب پر
اِسے کہتے ہیں بسم اللہ خوانی ؛ نہیں ہے کوئی تقریب اِس سے بہتر
کلام اللہ کا پڑھنا پڑھانا ؛ سعادت ہی سعادت ہے سراسر
مُبارک ہو مُبارک ہو مُبارک ؛ یہی تقریب ہے مُشتاق کے گھر
بنا نوشاہ نورِ چشم اِن کا ؛ خجستہ طالع و فرخندہ اختر
نہو نامِ خدا کیوں؟ فخر اجداد ؛ کہ یہ بچّہ ہے ہم نامِ پیمبر

کروں تاریخ کی کیا فکر حاوی

سنِ ہجری ہے تیرہ سو چھہتّر

۱۳۷۶ھ

قطعہ تاریخ تسمیہ برخوردار محمد مجتبیٰ حسین عرف طٰہٰ
فرزند مکرمی شیخ حسین صاحب مشتاق

مقرر شد بہ رمضان المبارک ؛ چہ تقریبے کہ او تقریب دین است
دراں ماہے کہ قرآں گشت نازل ؛ ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است
مبارک خواندنِ اقراء بہ طٰہٰ ؛ کہ عرفش ہم بہ قرآن مبین است
مکن فکرِ سنِ تسمیہ حاوی
بگو۔ نام خدا خوانی ہمیں است
۱۹۵۹ء

م ۸ رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ ۱۸ مارچ ۱۹۵۹ء روز چہارشنبہ

مُسدّس

الحاج مولوی میر بہادر علی جوہر کی حج سے واپس ہونے کی مسرت میں

وہ حرم جو ہے مکینِ دلِ مومن کا مکاں
جس کی دیواروں پہ ہے پرتوِ نورِ یزداں
سر جھکاتے ہیں جہاں صاحبِ دین و ایماں
قبلۂ اہلِ یقیں، کعبۂ اہلِ عرفاں
سجدہ گاہِ ملک و جن و بشر ہے یہ حرم
مختصر یہ ہے کہ اللہ کا گھر ہے یہ حرم

عظمتِ خانۂ کعبہ ہے بیاں سے باہر
خاکِ پاک اسکی ہے غیرتِ دہ مشک و عنبر
مرتبہ عرشِ بریں سے ہے کچھ اس کا بڑھ کر
اس جگہ آ کے بچھاتے ہیں ملک اپنے پر
رات دن رہتے ہیں افلاک بھی مصروفِ طواف
گردشِ شمس و قمر بھی ہے اسی کے اطراف

اک حرم اور جو ہے مامنِ دماوائے انام
یعنے کہتے ہیں مدینہ جسے سب خاص و عام
ہے یہ آرام گہہ بانیِ دینِ اسلام
متبرک ہے جگہ اور مقدس ہے مقام
مرقدِ فخرِ رسل روضۂ جنت ہے یہی
دیکھنے سے جسے واجب ہو شفاعت ہے یہی

جس نے سرکار مدینہ سے محبت رکھی
جس نے اس نورِ مجسم سے عقیدت رکھی
جس نے دل میں ہوسِ حج و زیارت رکھی
جس نے اللہ کے گھر جانے کی نیت رکھی
یاد فرمائیں گے سرکار کسی دن اسکو
دیکھ لو حاضرِ دربار کسی دن اس کو

جن کو یہ شوق یہ ارمان یہ حسرت ہو نصیب
جن کو یہ نعمتِ کونین یہ دولت ہو نصیب
جن کو یہ عز و شرفِ حج و زیارت ہو نصیب
جن کو یہ فخر یہ عزت یہ سعادت ہو نصیب
قابلِ رشک نہ کیونکر ہو مقدر ان کا
کیوں نہ ہو ذکر فرشتوں کی زباں پر ان کا

آئیں جو حج و زیارت سے مشرف ہو کر
احترام ان کا بھی لازم ہے بہت کچھ ہم پر
خیر مقدم کریں ان لوگوں کا با جوش و اثر
اپنی محفل میں جگہ دیں انہیں سب سے بہتر
کیوں کہ یہ خاص خدا ہی نے عطا کی عزت
اِن کی عزت ہے حقیقت میں خدا کی عزت

جو ادھر آتے ہیں زیارت سے مشرف ہو کر
ان کی گل پوشی بھلا کیوں نہ ہو لازم ہم پر
کیوں نہ محفل میں جگہ دیں انہیں سب سے بہتر
اِن کے کردار کا احباب پہ ہے خاص اثر

فضل سے اپنے خدا نے یہ عطا کی عزت
ان کی عزت ہے حقیقت میں خدا کی عزت

لامکاں والے کا یہ دیکھ کر آئے ہیں مکاں
ان کی پیشانی پہ ہے ارضِ مقدس کا نشاں
ان کا دل، دل نہیں ہے مخزنِ نورِ ایماں
مٹ گئے ان کے نوشتے سے گزشتہ عصیاں
کیوں نہ بڑھ جائے نگاہوں میں پھر عزت ان کی
ظرف عالی ہے تو سنجیدہ ہے فطرت ان کی

یہ شرف اور بزرگی جو خدا نے دی ہے
نیک بختی انھیں ایسی جو خدا نے دی ہے
استطاعت انھیں حاوی جو خدا نے دی ہے
کیسی نعمت ہے خدا کی جو خدا نے دی ہے
یہ مدینہ یہ زیارت ہو مبارک ان کو!
عہد و پیمانِ شفاعت ہو مبارک ان کو!

ہو مبارک تمھیں جو ہے یہ ذہاب اور ایاب
خیر مقدم کریں اب کیوں نہ خوشی سے احباب
اک عبادت میں لیا لاکھ عبادت کا ثواب
لوٹ کر لائی وہ دولت کہ نہیں جس کا حساب
تم بڑے دل کے ہو احباب میں تقسیم کرو
اپنے سرمائے کو اس طرح چھپا کر نہ رکھو

ایک دن ہم کو بھی ہو فخر حضوری حاصل
ایک دن ہم بھی ہوں حجاج کی صف میں شامل
ایک دن ہم بھی مدینے کو بنائیں منزل
ایک دن نکلے ہماری بھی تمنائے دل

قطعۂ تاریخ وصالِ پُرملال شیخ الاسلام قدوۃ الانام حضرت سیّد محمّد بادشاہ حسینی ؒ

مولوی سیّد محمّد بادشاہ:
آں کہ بردازہمسراں گوئے فلق
برد جانِ پاک او دستِ اجل
سینۂ اہلِ دکن را کردہ شق
از وصالش عالمے اندوہ گیں
رحلتش آفاق را وجہِ قلق
ثُلْمَةٌ فِي الدِّينِ ہست ایں سانحہ
گشت پیدا رخنہ در دینِ حق
بہرِ توصیفش زباں قاصر دلے
ہر ستائش راست ذاتش مستحق
رہبرِ دیں بود از بدوِ شعور
صرف کردہ عمر در تبلیغ حق
لب تبسّم ریز ہنگامِ لقا
خندہ روئی حایلِ رنگِ شفق
عاشقانہ کیف مُضمر در کلام
عارفانہ ذوق عنوانِ سبق
در طریقت بادہ خوارِ غوثِ پاک
در شریعت بستہ نظم و نسق

ازلبِ حادی شنو سالِ وصال
شیخ الاسلام دکن واصل بحق

۱۳۶۱

نظم بروفات حضرت صفی اورنگ آبادی رح

آج فیضِ سُخن سے ہے محروم
کیوں نہ اہلِ دکن رہیں مغموم

چل بسا شہ سوارِ عرصۂ نظم
جسکی غزلوں کی جا بجا تھی دھوم

شعر وہ فی البدیہہ کہنے میں
تھا دکن کا عَمرو بن کلثوم

بندش ایسی کہ سلکِ مروارید
یعنی ہر لفظ گوہرِ منظوم

ذوق انگیز وہ ہر اک معنیٰ
ندرت آمیز وہ ہر اک مفہوم

وہ زباں پھر بیاں پہ قدرتؔ
برمحل وہ محاروں کا لزومؔ

وہ جو زورِ بیاں کا قائل تھا
ضعفِ تالیف اس کو کیا معلوم

ناگوار اُس کو عامیانہ روش
ناپسند اُس کو سال خوردہ رسوم

تھے ادب کے فنون سب کے سب
ذات سے اس کی لازم و ملزوم

اب کہاں قادر الکلام ایسا
ثانیٔ داغ دہلوی مرحوم

تھا وہ خدمت گزار اُردو کا
ایسے خادم کو کہتے ہیں مخدوم

زندگی اُس نے کس طرح کاٹی
ملنے والوں کو بھی نہیں معلوم

تھی قناعت پذیر طبع غیور
کس مپرسی نہ کر سکی مغموم

اب جو بعد اُس کے سر اُٹھاتے ہیں
اس کے آگے تھے دشنہ بہ حلقوم

بلبلِ بوستانِ شعر و سخن
خوش نوائی سے ہوگیا محروم

وہ چمن کا نکھار ہی نہ رہا
چل گئی یک بہ یک جو بادِ سموم

لُٹ گیا لُٹ گیا غزل کا سہاگ
تجھ کو پیک اجل یہ کیا معلوم

اُٹھ گیا ہائے کیا" غزل کا امامؔ
ہے غزل ختم بس فقط مرقوم

تھا وہ پیغمبرِ سخن حاوی
اور پھر لطف یہ کہ نا معصوم

نہ رہا مدّ ظلّہٗ کا محل
کہیئے اب حضرتِ صفی مرحوم



نظم "نعم البدل"

موت کو برحق سمجھیے یا عناصر کا خلل
ایک بے چارے کا بیٹا ہو گیا نذرِ اجل

جمع ہو کر اپنے بیگانے اعزّہ اقربا
کر چکے جب دفن میّت حسبِ دستورِ عمل

باپ کے گو نہ دلاسے اور تسکین کے لیے
گفتگو ہر شخص کرتا تھا بڑی ماقلّ و دلّ

کوئی کہتا "کون اس دنیا میں رہتا ہے مدام"
کوئی کہتا "صبر کیجیے! صبر کا میٹھا ہے پھل"

کچھ نہ کچھ کہتا تھا ہر اک. ایک صاحب نے کہا
"غم نہ کیجیے! آپ کو دے گا خدا نعم البدل"

ایک شیخی باز۔ ان پڑھ بھی وہاں موجود تھے
سنتے ہی نعم البدل سمجھے کہ ہے اچھی مثل

[illegible] ہی پڑتا ہے. اس کو یاد رکھنا چاہیے
آج کی یہ بات ممکن ہے جو کام آجائے کل

جس محلے میں رہا کرتے تھے یہ عالی جناب
ایک بڈھے آدمی کا آگیا وقتِ اجل

دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا کو کہہ دی خیرباد
زندگی کے فلسفے کو کر دیا۔ اک دم نے حل

کوئی کہتا تھا کہ "ہے کیا زندگی کا اعتبار
آدمی ہے بُلبلا پانی کا۔ سچی ہے مثل"

وارثوں کا شور سن کر دوڑے ہمسائے کے لوگ
جب سُنا یہ۔ کوئی بولا "وہ ملے تھے مجھ سے کل"

کوئی بولا "خیر جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا
اب کریں سامان جلدی دن کہیں جائے نہ ڈھل"

لاش کی تدفین بھی آناً فاناً ہو چکی
اس کو کہہ سکتے بھی ہیں مرحوم کا حُسنِ عمل

وہ حماقت بیگ بھی تھے ابتدا ہی سے شریک
اپنی طرزِ خاص سے ہر بات کرتے بے محل

سب محلے والے جب تدفین سے فارغ ہوئے
یہ بھی ہمدردی جتانے کے لیے آئے نکل

اور آگے بڑھ کے اس بوڑھے کے بیٹے سے کہا
"آپ کو اللہ دے مرحوم کا نعم البدل"

اک ہنسی کی لہر دوڑی سننے والوں میں وہاں
تعزیت کے موقع پر پڑ گئے پیٹوں میں بل

اندھی تقلید اس طرح کرنے سے کچھ حاصل نہیں
مضحکہ ہوتی ہیں وہ باتیں نہ ہوں جو برمحل

بذلہ سنجی میں رہے اصلاح بھی پیشِ نظر
جی کا بہلانا نہ ٹھہرے شاعری کا ماحصل

دوستوں سے اپنے حاویؔ داد کا طالب نہیں
نظم کا عنواں ہے خود اپنی جگہ "نعم البدل"

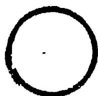


قطعۂ تاریخ

وفات حسرت آیات الحاج حبیب یٰسین یاس بغدادی
تلمیذ حضرت صفی اورنگ آبادی

انا للہ حبیب یٰسین نے قیدِ ہستی سے پائی آزادی
دیدہ پُرنم ہے اور دل بے چین سب ہیں اہل و عیال فریادی
چھوڑ دُنیا کو چل بسے حادی حیف صد حیف یاس بغدادی

۱۳۸۴ھ



اونٹ

دورانِ ترتیب دیوان استاذی حضرت حادی مجھے "اونٹ" پر دو نظمیں ملیں۔ ان ہی کاغذات میں حضرت صفی اورنگ آبادی کی ایک نظم "اونٹ" پر بقلم حضرت حادی دست یاب ہوئی۔ میں بڑا کشمکش و پیچ میں رہا کہ ایک ہی عنوان "اونٹ" پر استاد و شاگرد کی نظموں کی کیا توضیع ہو سکتی ہے اس عرصہ میں جناب محمد نورالدین خان صاحب سے ملنے ان کے مکان گیا۔ باتوں باتوں میں نظم اونٹ کا ذکر آ گیا موصوف نے بیان کیا کہ نظم اونٹ کے بارے میں کچھ لکھنا وہ اپنی تصنیف "سوانح عمر صفی اورنگ آبادی" میں بھول گئے۔ موصوف نے بتایا کہ: "ایک دفعہ وہ حضرت ابوالنصر محمد خالدی صاحب کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے جناب خالدی ماضی میں گم صفی اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی بیان فرما رہے تھے دورانِ گفتگو فرمایا کہ صفی مرحوم کے ایک بے تکلف دوست تھے عبدالرؤف خان صاحب مددگار لوکل فنڈ اونچے اور لمبے قد کے تھے۔ دوستوں نے انھیں اونٹ کا خطاب دے رکھا تھا جیسا کہ ہمارے معاشرہ میں اونچے قد کے آدمی کو اونٹ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ عبدالرؤف خان صاحب اونٹ کہنے سے چڑتے تھے ایک دن صفی مرحوم کو شرارت سوجھی ایک مشاعرہ کے انعقاد کا اعلان کر دیا اور اپنے شاعر دوستوں اور شاگردوں سے خواہش کی کہ اونٹ پر نظم کہیں۔ مزہ کی بات یہ کہ مشاعرہ کے لیے جگہ کا انتخاب "مسجد شتر خانہ" دارالشفاء میں کیا۔ مقررہ دن تاریخ تمام شاعر بعد نماز عشاء مسجد شتر خانہ میں جمع ہوئے اور اونٹ پر اپنی دلچسپ نظمیں سنائیں۔ عبدالرؤف خان صاحب بھی موجود تھے اور زیادہ تر نشانہ کی زد پر وہی رہے۔ جناب خالدی نے فرمایا کہ وہ اس یادگار مشاعرہ میں شریک تھے۔ صفی مرحوم نے دو نظمیں سنائی تھیں۔ دیگر شعراء نے بھی اونٹ پر

طبع آزمائی کی تھی۔ جناب ہادی کی نظم کی بہت تعریف ہوئی تھی صفی مرحوم کے دوست میر عابد علی غیور نے بھی اچھی نظم کہی تھی۔ ان کا ایک شعر جناب خالدی کو بہت پسند آیا تھا برسوں گزرنے کے بعد بھی اپنے حافظے کے نہاں خانے سے برآمد کر کے سنایا:

تھا ازل میں جمع کچھ بے ڈھنگے پن کا مادہ
اُڑ گیا سو اُڑ گیا جو رہ گیا وہ اونٹ ہے (غیور)

جناب حضرت صفی کی نظم بہ عنوان "اونٹ" کسی مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے۔ بعض غیر مطبوعہ دیوان میں میں نے دیکھی ہے" (بیان محمد نورالدین خاں صاحب)

محترم ہادی صاحب کی دو نظمیں "اونٹ" پر کاغذات میں موجود ہیں ایک نظم اور ایک سترس کے قالب ہیں۔ میں نے مناسب یہی سمجھا کر حضرت ہادی کی نظموں کی طباعت کے ساتھ ان کے استاد حضرت صفی کی نظم بھی زیور طبع سے آراستہ ہو جائے تو شائقین ادب کی تفریح طبع کا سامان ہوگا۔ لہٰذا حضرت صفی کی نظم بعنوان "اونٹ" تبرکاً نہ پیش ہے۔

(مرتب)

اونٹ

شکل وصورت سے پتہ چلتا نہ تھا وہ اونٹ ہے
قد نے اس کے اب یہ ظاہر کر دیا وہ اونٹ ہے

چال اس کی دیکھ کر سب نے کہا وہ اونٹ ہے
اونٹ کو بھی اب تو یاد آ گیا وہ اونٹ ہے

اونٹ سے کیا ہو بھلائی یا بُرائی کا گلہ
یہ تو ظاہر ہے بھلا ہو یا بُرا وہ اونٹ ہے

فیصلہ کر دے کمیشن اس کی تحقیقات کا
فی الحقیقت ہے کوئی انسان یا وہ اونٹ ہے

اُونٹ ماموں جو اسے کہتے ہیں سمجھائیں مجھے
قد کسی کا ہو جو چھ فٹ کا تو کیا وہ اونٹ ہے

چال تو ایسی عرب کے اونٹ کی ہوتی نہیں
ہاں یہ کہہ سکتے ہیں ملک ہند کا وہ اونٹ ہے

جس نے یہ مصرعہ کہا حاوی نہایت سچ کہا
سارسوں کا باوا آدم اونٹوں کا وہ اونٹ ہے

اونٹ کو دیکھ کر

تو بھی کیا چیز ہے اے بادیہ پیمائے عرب
فرش ہے تیرے لیے دامنِ صحرائے عرب
تیرے محمل سے عیاں جلوۂ لیلائے عرب
تیری خدمات کی ممنون ہے دنیائے عرب
انبیا کی جو سواری کی ہے عزت تجھ کو
یوں بھی حاصل ہے بہائم میں فضیلت تجھ کو

تجھ سے کیوں اُنس ہے اے وحشیِ صحرائے عرب؟
کیوں تجھے چاہتے ہیں وامق و عذرائے عرب؟
تیری گرویدہ ہوئی کس لیے سلمائے عرب؟
کیوں ترے مدح سرا بن گئے ابنائے عرب؟
ہم کو معلوم ہو آخر کہ وہ کیا خوبی ہے؟
اونٹ رے اونٹ اتری کون سی کل سیدھی ہے؟

کیا ہی بے ڈول سراپا ہے سراپا تیرا
نہیں ملتا کسی حیوان سے نقشا تیرا
باوا آدم ہے زمانے سے نرالا تیرا
باوجود اس کے مگر بول ہے بالا تیرا
بار برداری ترا شیوہ ترا مذہب ہے
رہروانِ عربستاں کا تو مرکب ہے

شہرۂ آفاق زمانے میں ہے تیری تگ و تاز
ریگزاروں کا تو کہلاتا ہے دنیا میں جہاز
قطع کر جاتا ہے ہر فاصلۂ دور و دراز
راہ چوتا نے کا ہو دشت کہ صحرائے حجاز

زینتِ ریگِ بیاباں ترے نقشِ کفِ پا
تیرے حق میں ہے زمیں اس کی حریر و دیبا

بھوک اور پیاس کی برداشت میں تجھ کو ہے کمال
نہ ملے بھی جو نہ الو نہیں ہوتا تو نڈھال
چاہے جو حال ہو رہتی ہے تری ایک ہی چال
جانتا ہی نہیں کہتے ہیں کسے اضمحلال

اے کہ حیوانی و از جنسِ بہائم ہستی
از کہ آموختۂ ہمچو صفاتِ ملکی؟

ذات سے تیری ہیں کیا راحت و آرام نصیب
ذبح کرتے ہیں تجھے ہوتی ہے جب کچھ تقریب
تیرے ایثار کے ممنون مُجاب اور مجیب
فائدہ تجھ سے اُٹھاتے ہیں غنی ہو کہ غریب

دودھ اور گوشت سے تیرے ہے مدارِ اعراب
کیوں نہ ہو ذات تری فخر و مباہاتِ عرب

تیرا کوہان جو ہے پیٹھ پہ تھوڑا سا اُبھار
یعنی تربت جسے کہہ سکتے ہیں چربی کا مزار
دیکھنے کو تو ہے یہ چیز بظاہر بے کار
تقویت کا تری اس پہ ہے مگر دار و مدار

ریگزاروں میں نہیں ملتی ہے جب کوئی غذا
یہی چربی ہے ترے واسطے قوتِ اعضا

دُور سے دیکھتے ہیں جب کہ خراماں تجھکو
اپنی آغوش میں لیتے ہیں بیاباں تجھکو
مست کرتے ہیں جو نغموں سے حُدی خواں تجھکو
پھر تو صحرائے لق و دق ہیں گُلستاں تجھ کو

ساربانوں کے لیے نعمتِ عُظمیٰ تو ہے
اُن کی اِس بادیہ پیمائی کا سودا تو ہے

محنت و رنج و مشقت کا بہت ہے عادی
ایک سے ہیں تجھے ویرانہ ہو یا آبادی
رات دن طے کیے منازل ترے حق میں شادی
الغرض تجھ کو ہے صحرا میں عجب آزادی

رہگزاروں ہی میں ہوتی ہیں بہاریں تیری
کیا مزہ دیتی ہیں صحرا میں قطاریں تیری

تیری فطرت میں یہ مسکینی یہ غُربت کیسی؟
تیری صورت کے مقابل میں یہ سیرت کیسی؟
دیکھنے سے تجھے ہادیؔ کو ہے حیرت کیسی؟
تجھ کو حاصل ہے زمانے میں یہ شُہرت کیسی؟

اپنی حالت کی بھی کچھ آج خبر ہے تجھ کو؟
یا اطاعت ہی فقط مدِّنظر ہے تجھ کو؟

○

شُترِ بے مہار

[فرمودہ حضرت صفیؔ اورنگ آبادی]

وہ سرو قد بھی ہے بازار میں تماشا اونٹ
کسی کی اونٹنی وارفتہ ہے کسی کا اونٹ

ادھورا تم کو یہاں تک سمجھتے ہیں احباب
اتارتے نہیں تصویر میں کبھی پورا اونٹ

تم اپنے گھر سے جو نکلو۔ یہ ہو ہجوم خلق
کہ جیسے ہوتا ہے دیہات میں اچنبا اونٹ

عنان نفس نہ دے اپنے ہاتھ سے غافل
خبر نہیں شُترِ بے مہار کس کا اونٹ

الٰہی خلد میں ہوگا کہاں شُتر خانہ
جو سب کو اونٹ کے بدلے وہاں ملے گا اونٹ

ملائکہ نے وہی آلہ پھینک کر مارا
ذرا بھی جس کے مناسب کبھی نہیں تھا اونٹ

یہ اس کے بخت کے بے جا لگی چپک بھی گئی
بہار رہا ہے اسی دن سے الٹی گنگا اونٹ

یہ ہاتھی اونٹ فقط سانس تک ہے اے منعم
جو اکھڑی سانس تو پھر کس کا ہاتھی کس کا اونٹ

بہت بجا ہے بڑوں کی ہر ایک بات بڑی
کہ بیٹھ جاتے پہ بھی ہے گدھے سے اونچا اونٹ

اٹھا کے بار امانت بنا ہے خود جاہل
بشر بھی واقعی! پورا گدھا ہے خاصا اونٹ

غزل ہوئی ہے یہ تعطیل عید قربان میں
نہیں تو سر بھی کٹا کر صفی! نہ ملتا اونٹ



فہرستِ تلامذہ[۱]

جنھوں نے حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کی وفات کے بعد اُستادی
حضرت حادیؔ مغفور سے اُن کی زندگی تک استفادۂ سخن کیا [انجم]

نمبر	نام	تخلص
۱۔	ارادت علی خان	ارادتؔ
۲۔	افسر الدین خان	افسرؔ
۳۔	اقبال الدین خان	اقبالؔ
۴۔	لطیف الدین خان	لطیفؔ
۵۔	محمد علی خان	تہوّرؔ
۶۔	عبدالقادر	ظریفؔ
۷۔	احمد علی خان	عاقلؔ
۸۔	نواب مظہر الدین خان	مظہرؔ
۹۔	میر احمد علی	پیکالؔ
۱۰۔	سید افضل الدین غوری	تبسّمؔ
۱۱۔	سعادت اللہ خان	ثاقبؔ
۱۲۔	رحیم الدین حسین خان	جعفرؔ
۱۳۔	میر بہادر علی	جوہرؔ
۱۴۔	صالح المصلی	حامیؔ
۱۵۔	محمد یوسف علی	خلوصؔ
۱۶۔	میر رحیم الدین علی خان	ربطؔ
۱۷۔	محمد عبدالرزاق	رضاؔ
۱۸۔	غلام قادر صدیقی	سالکؔ
۱۹۔	ابو محمد سید علی	سریرؔ
۲۰۔	صابر علی شاکر	شاکرؔ
۲۱۔	سجاد علی	صافیؔ
۲۲۔	میر دلاور علی	ضابطؔ
۲۳۔	فخر الدین	عالیؔ
۲۴۔	غلام محمد غوث مدنی	علیمؔ
۲۵۔	خواجہ محمد احمد عبدالوہاب	غنیؔ
۲۶۔	شیخ حسین	شائقؔ
۲۷۔	میر سرفراز علی	ناوکؔ
۲۸۔	سید دستگیر پاشاہ	نیرنگؔ
۲۹۔	سید حبیب یٰسین	یاسؔ
۳۰۔	سید غوث	یقینؔ
۳۱۔	محمد عبدالوحید	یکتاؔ
۳۲۔	سید یوسف الدین	یوسفؔ
۳۳۔	غلام معین الدین	یوسفیؔ

---

[۱] شاگردانِ صفیؔ

قطعہ جناب صدیقی

وفات حسرت آیات الحاج حضرت غلام علی حاوی (جانشین حضرت صفی اورنگ آبادیؒ)

ہو گئے ہیں داخلِ خلد بریں !!
حضرتِ حاوی صفی کے جانشین

صاحبانِ فن نہ کیوں مغموم ہوں
کیوں نہ ہوں اہلِ ادب اندوہ گین

پھٹ پڑے پھر کیوں نہ اُن پر آسماں
جب کہ ہو استادِ فن زیرِ زمین

سچ ہے صدیقی کہ حاوی کی طرح
کوئی فن کار اب نظر آتا نہیں

جن کے قائل تھے اہلِ ہُنر
جن کے اکثر مُبتدی تھے خوشہ چیں

جن کی جودت کا زمانہ معترف
بحر پر جن کا تبحّر بالیقیں

کیفی مرحوم کی تھے یادگار
گنجِ داغ دہلوی کے تھے امیں

مغفرت حاوی کی ہو ہے یہ دُعا
صبر دے شاکر کو ربّ العالمین!



نتیجۂ فکر:۔ حضرت عبدالعلی صدیقیؒ

تلمیحات

تلمیحات

انوری :- اوحدالدین محمد انوری دشت خاوراں خراسان کے جنوب میں بدنہ نامی قریہ میں پیدا ہوا۔ اور اسی مناسبت سے ابتداء میں خاوری اور پھر انوری تخلص اختیار کیا۔ وہ ایران کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر گزرا ہے۔ سلطان سنجر کا دورِ حکومت انوری کے سب سے زیادہ عروج کا زمانہ تھا۔ وہ علوم حکمت، ریاضی اور نجوم میں بھی ماہر تھا۔ انوری کی غزل کا رنگ بھی خوب ہے۔ اس نے بڑی اچھی غزلیں کہی ہیں۔ ہجو لکھنے میں بھی وہ ماہر تھا۔ غزل گوئی میں اس کا مرتبہ متقدمین شعراء اور اس کے بعد آنے والے شعراء سے کم نہیں۔ انوری کا زمانہ آسمانِ ادب کے ستاروں کے یکجا جمع ہونے کا زمانہ تھا۔ نظامی، خاقانی، ادیب صابر، ظہیر فاریابی، رشید الدین وطواط، معزی، ابوالفرج رونی، عمق بخارائی جیسے نامی گرامی شعراء اس کے ہم عصر تھے۔ انوری کی تاریخِ وفات میں بڑا اختلاف ہے۔ جو بات صحت سے قریب معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ۵۸۷ھ کے قریب وفات پائی۔

ابونواس :- اسلامی عہد کی ابتدائی صدیوں میں عربی زبان سیکھ کر ایران نے بڑے بڑے عربی گو شاعر پیدا کئے۔ ان شاعروں میں مشہور ترین شاعر بشار بن برد اور ابونواس ہیں۔ بشار مادر زاد اندھا اور عباسیوں کے دربار کا مشہور شاعر تھا۔ اسی طرح ابونواس بھی عباسی عہد کے درباری شاعر کی حیثیت سے بڑی شہرت رکھتا ہے۔ اس کے اشعار اور دلکش کلام دیوان کی شکل میں باقی ہیں۔ یہ ۱۲۰ھ میں بمقام اہواز پیدا ہوا اور ۱۹۰ھ یا ۱۹۵ھ میں وفات پائی۔

خاقانی :- افضل الدین بدیل بن علی خاقانی کا شمار ایران کے مشہور ترین

اور اول درجہ کے قصیدہ گو شاعروں میں ہوتا ہے۔ خاقانی ٥٢٠ھ میں بمقام شروان پیدا ہوا۔ اس نے پہلے حقائقی لقب اختیار کیا پھر خاقان اکبر منوچہر بن فریدوں شروان شاہ سے انتساب کی مناسبت سے خاقانی تخلص پایا۔ خاقانی کے باپ کا نام علی تھا وہ نجاری کا پیشہ کیا کرتا تھا۔ اس کی ماں اس عہد کے ایک عیسائی خاندان سے تعلق رکھتی تھی جو بعد میں مشرف بہ اسلام ہوئی۔ اس نے بڑی تنگ دستی اور عسرت میں زندگی بتائی۔ باپ کی بے وقت موت نے لڑکپن ہی میں پدرانہ شفقت سے محروم کر دیا۔ اس کی ماں طباخی اور جلاہی کا پیشہ کرتی تھی اسی سے اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پالتی تھی۔ پچیس ٢٥ سال کا ہوا تھا کہ شفیق چچا کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ عمر کا آفتاب ڈھلنے کو ہوا تو ٥٧١ھ میں جوان سال بیٹا داغِ مفارقت دے گیا۔ غرض یہ کہ خاقانی نے تمام عمر ابنائے روزگار کے ہاتھوں ستم سہے۔ صدموں پہ صدمے اُٹھائے۔ پچاس سال کی عمر میں قید و بند کی مشقتیں جھیلیں اور دنیا نے اسے کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا لیکن اس کے باوجود وہ اپنی بردباری اور عزت نفس کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

خاقانی کی پرورش اس کے چچا کی عالمانہ سرپرستی میں ہوئی جو فلسفہ اور حکمت کا ماہر تھا۔ اس کے علاوہ اپنے گہرے مطالعہ اور دیگر علماء سے اکتساب فیض کے ذریعہ خاقانی نے ادب، فلسفہ، قرآن اور علوم دینی میں کامل دستگاہ پیدا کی تھی۔ اس کا کلام ان علوم میں مہارت کا آئینہ دار ہے۔ اس کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی زبان کی طرح عربی زبان پر بھی کامل عبور رکھتا تھا۔ الفاظ اور ترکیبوں کا وہ گویا بادشاہ ہے۔

خاقانی نے ٥٩٥ھ میں بمقام تبریز وفات پائی اور مقبرۃ الشعراء میں دفن ہوا۔ ان شعرائے کرام کے بارے میں مزید تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھئے "تاریخ ادبیات ایران" مترجمہ سید مبارز الدین رفعت مطبوعہ دہلی ١٩٨٥ء

نہایت بلند پایہ، بعدِ اسلام ایران کا پہلا بڑا شاعر ابو عبداللہ جعفر بن محمد رودکی سمرقند کے قریب قصبۂ رودک میں پیدا ہوا تھا۔ عالموں، فاضلوں اور ہم عصر شعراء کے علاوہ متاخرین نے بھی اس کی ہنرمندی اور کمالِ فن کی خوب تعریفیں کی ہیں۔ رودکی کو قصیدہ، رباعی، مثنوی، قطعہ، غزل غرض تمام فنون اور انواع شعر میں مہارت حاصل تھی اور وہ ہر طرز میں ماہر رہا ہے۔ خاص کر قصیدہ گوئی میں وہ سب کا پیش رو اور استاد مانا جاتا ہے۔ رودکی کے کمالات میں سے موسیقی میں اس کی مہارت اور نغمہ سرائی کا کمال ہے جس کا ذکر تمام تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ وہ سامانی بادشاہوں کی خدمت میں اپنے شعر گا کر سناتا تھا اور چنگ بجاتا تھا۔ اس نے بڑی طویل عمر پائی تھی اور شادماں زندگی بسر کی تھی۔ اگر اس کے اندھے ہونے کی روایت صحیح ہے تو اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اس کی اندرونی روشنی نے بیرونی تاریکی پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ اس نے ایسی توانائی کے لیے اربعہ عناصر کی طرح چار وسائل دریافت کئے ہیں جنھیں بجا طور پر زندگی کے چار رکن کہا جا سکتا ہے اور وہ ہیں: خرد تندرستی، نیک خوئی اور نیک نامی۔ رودکی کی اہم تصنیف منظوم "کلیلہ و دمنہ" تھی جو اب نایاب ہے۔ اس خدمت کے صلہ میں اسے بادشاہ کی طرف سے چالیس ہزار درہم انعام میں ملے تھے۔ اس نے ۳۲۹ھ میں وفات پائی۔

سعدی:۔ شرف الدین مصلح بن عبداللہ سعدی شیرازی ایران کے آسمانِ ادب کے درخشاں ستارہ تھے جنھوں نے فارسی نظم و نثر کی فصاحت اور بلاغت کو درجۂ کمال پر پہنچایا۔ تاریخی قرائن سے سنہ پیدائش کا مفروضہ حقیقت سے قریب کر دیتا ہے کہ ان کی ولادت ۶۰۶ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی جیسا کہ "پنجاہ رفت و درخوابی" والے شعر سے ظاہر ہے۔ سعدی علیہ الرحمہ کے اجداد اہلِ علم و دانش تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم شیراز میں حاصل کی اس کے بعد بغداد روانہ ہوئے۔ ایران کے حالات اور سیاسی کشمکش سے ان کا دل اپنے وطن سے اچاٹ ہوگیا اور انہوں نے شوقِ جہاں گردی میں

تیس سے چالیس سال کی مدت مسافرت ہی میں گزار دی۔ امن و امان قائم ہونے کے بعد یہ جہاں دیدہ شاعر کسبِ علوم و فنون کے ساتھ تجاربِ معنوی اور افکارِ عالیہ کی ایک دنیا لئے ہوئے شیراز واپس ہوا۔ ۶۵۵ھ میں "بوستان" نظم کی اور اس کے ایک سال بعد "گلستان" تصنیف کی۔ ان دو تصانیف کے علاوہ قصائد، غزلیات، قطعات، ترجیع بند، رباعیات، مقالات اور عربی قصائد بھی ہیں جو ان کے کلیات میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ سعدیؒ ان خوش نصیب شاعروں میں تھے جنھوں نے اپنی ابتدائے جوانی ہی میں اپنی شہرت کا غلغلہ سُنا اور تمام اسلامی ممالک اور دنیائے علم و ادب میں ایسی ناموری حاصل کی کہ شاید ہی کسی کو حاصل ہوئی ہو۔ ان کی تصانیف کا ترجمہ دُنیا کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ان کی حکایات اور پند و نصائح اپنے اسلوب اور دل نشین پیرایۂ بیان کی وجہ سے عالمی مقبولیت اور شہرت کے حامل ہیں۔ آج سے تقریباً سات سو سال پہلے جب کہ ساری دنیا تاریکی جہالت اور اندھیرے میں غرق تھی سعدی علیہ الرحمۃ نے اپنے زمانے کے حکمرانوں کے راستے پر ایک چراغِ ہدایت روشن کیا اور نہایت بے باکی کے ساتھ شگفتہ اور دلپذیر انداز میں بادشاہوں اور امیروں کو عدل و نیکوکاری کی طرف متوجہ کیا۔ ان کے عارفانہ مسلک، طرزِ سخن اور دیگر شاعرانہ افکار کا جائزہ لینے کے لیے "تاریخ ادبیات ایران" کا مطالعہ ضروری ہے۔

سعدی شیرازی نے ۶۹۱ - ۶۹۴ھ کے درمیانی سالوں میں اپنے وطن شیراز میں وفات پائی اور اسی شہر میں دفن ہوئے۔

عطار:۔ شیخ فریدالدین محمد المعروف بنام عطار نیشاپور میں پیدا ہوئے ان کی تاریخ ولادت قطعی طور پر معلوم نہیں۔ بہر صورت وہ چھٹی صدی ہجری کے وسط یعنی خراسان کے سلجوقیوں کے آخری دور میں پیدا ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنی جوانی کا زمانہ علوم و معارف کی تحصیل، مشائخ کی خدمت

تہذیبِ نفس اور کسبِ علوم میں گزارا اور آگے چل کر مقامِ ارشاد پر فائز ہوئے اور اہلِ دل کا کعبہ بنے۔ وہ کافی سفر کیے تھے اور مصر، دمشق، ہندوستان، ترکستان، اور مکہ کی سیاحت کی تھی۔ صوفی شعراء میں ان کا بہت اونچا مقام ہے۔ وہ تمام عمر عشقِ الٰہی کی آگ میں جلتے رہے۔ اسی معرفت کے راستے گامزن ہوکر عرفان کے اُفق پر چمکے اور مشعل کی طرح نزدیک اور دُور لوگوں کے راستے منور کر دیئے۔ یہی وجہ ہے کہ عارف شاعروں کے امام مولانا جلال الدین انھیں اپنا بزرگ اور پیشوا مانتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں اپنے آپ کو ہیچ شمار کرتے ہیں۔

عطار بہت بسیار نویس تھے۔ بعض لوگوں نے ان کی تصانیف کی تعداد قرآن کی سورتوں کی تعداد کے برابر لکھی ہے۔ افسوس کہ تمام تصانیف باقی نہیں رہیں جو تھوڑی بہت تصانیف باقی رہ گئیں ہیں ان میں بھی اختلاف ہے۔ "مصیبت نامہ"، "الٰہی نامہ" اور "خسرو نامہ" مثنویوں کے علاوہ انہوں نے "پند نامہ"، "اسرار نامہ"، "جواہر نامہ"، "شرح القلب"، "مختار نامہ" وغیرہ کے نام سے اور بھی مثنویاں لکھی ہیں۔ لیکن ان سب سے بڑی یادگاروں میں [۱] "قصائد اور غزلیات کا دیوان" [۲] "مثنوی منطق الطیر" اور [۳] "تذکرۂ اولیاء" کا شمار کیا جاتا ہے۔

شیخ عطار کی وفات کی تاریخ میں بڑا اختلاف ہے۔ روایتوں کی بموجب ۶۲۷ھ میں مغلوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے اور ان کی تربت نیشاپور کے جنوب میں بمقام شادیاخ موجود ہے۔

ہومر: ہومر آٹھویں صدی قبل مسیح کا منفرد صاحبِ طرز یونانی شاعر گزرا ہے۔ یورپ کے ادب اور شاعری کی تاریخ میں اس کی شخصیت اور شاعری قدر دانوں، مداحوں اور تنقید نگاروں کا برسہا برس سے اختلافی بحث کا مرکز اور دلچسپ موضوع رہی ہے۔ ایلیڈ اور اوڈیسی [ILIAD AND ODYSSEY] اس کی فکرِ سخن کا عظیم الشان

اور بے نظیر کارنامہ ہے جس کا شمار عالمی ادب نالیہ میں کیا جاتا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق ایلیٹ کی سولہ ہزار اور اوڈیسی کی زائد از بارہ ہزار ابیات ہیں۔ جارج چاپ من نے ۱۶۱۱ء میں ایلیٹ کا اور ۱۶۱۶ء میں اوڈیسی کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ سترھویں صدی میں اس ترجمے کے بعد اٹھارویں صدی میں الگزینڈر پوپ نے ایلیٹ کا (۱۷۱۵ء ... ۱۷۲۰ء) اور اوڈیسی کا (۱۷۲۵ء ۱۷۲۶ء) کا ترجمہ کیا تھا۔ یونان کے دیگر شہرہ آفاق عظیم شاعر فلسفی، ادیب اور ڈرامہ نگار ہومر سے بہت متاثر تھے۔ سکندر اعظم اپنی مہمات میں "ایلیٹ" کا ایک نسخہ اپنے ساتھ رکھتا تھا کیوں کہ اس دور کے فاتحین اور قائدین اس کے مطالعے سے حوصلہ مندی اور رہبری حاصل کرتے تھے۔ روم کا حکمران اور علمی حلقہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بیشتر متاخرین نے اپنے ادبی کارناموں میں اس کی خوشہ چینی کی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ہومر پیدائشی اندھا نہیں تھا بلکہ عمر کے کسی حصے میں بصارت سے محروم ہوگیا تھا۔ اس کی پیدائش یا وفات اور دوسرے حالاتِ زندگی سے متعلق تاریخ میں ہمیں بہت کم معلومات ملتے ہیں۔ تاریخ انسانی، شاعری اور علم وادب میں شاید ہی کسی ایسی شخصیت کی مثال ملے جس نے ستائیس صدیوں سے زیادہ عرصے تک اہلِ دُنیا کے ذہنوں کو اس قدر متاثر کیا ہو جیسا کہ ہومر نے کیا ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد دوم مطبوعہ ۱۹۶۵ء (یو۔ یس۔ اے) صفحات ۶۲۹ تا ۶۳۲ ملاحظہ کیجئے یا مائیکل ہارٹ کی کتاب دی ہنڈرڈ [THE 100] مطبوعہ ۱۹۷۸ء نیو یارک صفحات ۴۸۶ تا ۴۵۹ دیکھئے۔

ابو سعید ابوالخیر۔ شیخ ابو سعید فضل اللہ بن ابی الخیر، بابا طاہر عریاں کے ہم عصر سلجوقی دور کے صوفی شاعر تھے۔ یہ خاوران خراسان کے نواح میہنہ میں ۳۵۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی۔ اس کے بعد فقہ کی تحصیل کے لیے مرو گئے اور اس زمانے کے مشہور فقیہ اور عالم الحصری کی شاگردی اختیار کی۔ مشہور بزرگوں جیسے ابوالفضل حسن سرخسی

ابوالعباس احمد قصاب اور ابوالحسن علی خرقانی سے معنوی فیوضات حاصل کئے اور مشہور صوفی بزرگ ابو عبدالرحمٰن سلمی (م ۴۱۲ھ) سے خرقۂ طریقت حاصل کیا۔ فارسی کے صوفی شاعروں کی اولین صف میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ابو سعید صوفیانہ عقائد کے اخلاق، رفتار، گفتار اور کردار میں رچ بس گئے تھے۔ وہ خوش زبان، شیریں بیان، شکستہ نفس اور مہربان تھے۔ تونگروں سے مال لیتے اور درویشوں میں لٹا دیتے تھے۔ ان کے پوتے محمد نور نے "اسرار التوحید فی مقامات الشیخ ابی سعید" شیریں فارسی میں تصنیف کی۔

شیخ ابوسعید نے ۴۴۰ھ میں وفات پائی۔ کہتے ہیں کہ مرض الموت میں ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے جنازے پر قرآن مجید سے کیا پڑھا جائے؟ تو فرمایا کہ قرآن کا مرتبہ اس سے کہیں بلند ہے کہ مجھ پر پڑھا جائے، بس یہ شعر کافی ہیں ؎

بہتر ازیں در جہاں ہمہ چہ بود کار
دوست بردوست رفت یار بر یار

آں ہمہ اندوہ بود ایں ہمہ شادی
آں ہمہ گفتار بود ایں ہمہ کردار

سبع مثانی: ۔ قرآن نے سورۃ فاتحہ کا ذکر "السبع المثانی" کے نام سے ایسے لفظوں میں کیا ہے جس سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝ (سورۃ الحجر آیت ۸۷: اے پیغمبر! یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تمہیں سات دہرائی جانے والی چیزیں عطا فرمائیں اور قرآن عظیم!) احادیث و آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں "سات دہرائی جانے والی چیزوں" سے مقصود یہی سورت ہے کیوں کہ یہ سات آیتوں کا مجموعہ ہے اور ہمیشہ نماز میں دہرائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت کو "السبع المثانی" بھی کہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تمام روایات جمع کردی ہیں۔ (شرح کتاب التفسیر

جلد ۸ صفحہ ۱۲ طبع اول) دیکھئے ترجمان القرآن جلد ا، نئی دہلی ۱۹۸۰ء۔

فغانی شیرازی:- بابا فغانی شیرازی نویں صدی ہجری کے اواخر اور دسویں صدی ہجری کے ربع اول کے قصیدہ گو شاعر تھے۔ صفوی دور کے مشہور شاعر عرفی کی طرح شیراز میں پیدا ہوئے۔ صفوی خاندان کا نام شیخ صفی الدین اردبیلی کی نسبت سے رکھا گیا تھا۔ اس خاندان کے ایک دلیر فتح مند نوجوان اسماعیل حیدر نے آق قوئینلو کو شکست دے کر ۹۰۵ھ میں صفویوں کی سلطنت کی بنیاد تبریز میں رکھی۔ یہ خاندان قریباً دو سو چالیس سال تک ایران پر حکومت کیا۔ صفوی بادشاہ متعصب شیعہ تھے اس لیے انہوں نے شیعیت کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا۔ شاعروں نے بادشاہوں کی مدح لکھنے کی بجائے نعت رسولؐ منقبت اولیاء اور آل رسولؑ کی مدح اور ان کے مرثیہ کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ فغانی کا تعلق سلطان یعقوب آق قوئینلو کے دربار سے تھا اور انھوں نے حضرت علیؑ کی مدح میں قصیدے لکھے۔ فغانی شیرازی کا انتقال ۹۲۵ھ میں ہوا۔

نظیری:- صفوی دور (۹۰۵ھ-۱۱۴۰ھ) کے اہم مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ زبان اور فارسی ادب کا ایران کے باہر اور خاص کر ہندوستان میں پھیلنا ہے۔ ہندوستان میں فارسی زبان ابتدائی اسلامی صدیوں ہی میں پہنچ چکی تھی۔ مغلوں کی سلطنت قائم ہونے کے بعد تو اوج کمال پر پہنچ گئی۔ جن شعراء کے ادبی شاہکاروں کا مطالعہ ہندوستان میں عام ہو گیا تھا ان میں فردوسی کے شاہنامہ اور سعدی کی گلستان، حافظ کے دیوان، جامی کی تصانیف مقبول عام تھیں۔ امیر خسرو اور عرفی شیرازی کے سوا جن ایرانی شاعروں نے صفوی دور میں ہندوستان میں شہرت پائی اور یہاں جاہ و منزلت حاصل کی ان میں نظیری نیشاپوری بھی قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے ۱۰۲۱ھ میں وفات پائی۔

بُحتری: ۔ ابو عُبادہ الولید بن عبید اللہ البحتری عباسی دور [۸۲۰ء تا ۸۹۷ء] کے نامور شاعروں میں سے ایک تھا۔ البحتری نے اپنی ابتدائی شاعری جو سولہ اور انیس سال کی عمر میں کی تھی اپنے قبیلہ کے بارے میں وقف کی۔ ۸۴۰ھ کے بعد عظیم المرتبت شاعر ابو تمّام کی نظر میں آنے کے بعد انہوں نے بحتری کی قصیدہ گوئی کی قدر دانی کے ساتھ ہمت افزائی کی اور خلیفہ بغداد کے دربار میں پہنچایا لیکن وہاں خاطر خواہ پذیرائی نہ ہونے کی وجہ سے ۸۴۴ھ میں شام واپس ہوگیا۔ پھر ۸۴۷ھ میں خلیفہ المتوکل کے دربار میں دوبارہ متعارف کرایا گیا۔ اس مرتبہ بحتری نے حرص، موقع پرستی اور مدح سرائی سے مابعد خلیفہ کے دور میں بھی خوب راحت اور آسائش کے مزے لوٹے اور قریباً ۸۹۲ھ میں اپنے مقام پیدائش (شام) کو عمر کے آخری ایام گزارنے واپس ہوگیا۔

بحتری کی مشہور تصنیف "حماسہ" ہے۔ اس کے کلام سے تاریخی واقعات پر روشنی پڑتی ہے اس لیے اس کی شاعری اس دور کی ترجمان کہلاتی ہے۔ اس کی پیدائش ۸۲۱ھ میں شام کے علاقہ مان بج میں ہوئی تھی اور اس کا انتقال بھی ۸۹۷ھ میں وہیں ہوا۔

[دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد دوم ص ۳۵۲، یو ایس۔ اے ۱۹۷۴ء]

رُومی: ۔ مولانا جلال الدین رومی کا نام آتے ہی "مثنوی مولانا روم" فوراً ذہن میں اُبھر آتی ہے۔ مولانا روم کا وطن بلخ تھا لیکن وہ روم میں سکونت اختیار کرنے کی وجہ سے اسی نسبت سے شہرت دوام حاصل کئے۔ وہ ایک صوفی بزرگ اور فارسی زبان میں تصوف کے رموز و نکات اور اسرار باطنی کو مثنوی کے سانچے میں نہایت خوبی اور عمدگی کے ساتھ ڈھال کر بیان کرنے میں منفرد اور اعلیٰ مرتبہ کے شاعر تھے۔ اہلِ تصوف کے نزد صوفیانہ مسائل کی توضیح و تشریح اور افہام و تفہیم کے لیے مثنوی کا اہم ترین اور بلند مقام ہے۔

فرزدق :۔ بنو امیہ کے عہد کا شہرہ آفاق عرب شاعر ۶۴۱ھ میں بصرہ میں تولد ہوا۔ اصلی نام ہمام تھا۔ اس نے بصرہ کے عوام کے خلاف طنزیہ کلام لکھا۔ نتیجہ کے طور پر فرار ہو کر پہلے کوفہ میں پھر مدینہ میں پناہ لینی پڑی۔ ایک عرصہ کے بعد بصرہ میں داخل ہونے کی اجازت ملی اور ایک اندازہ کے مطابق اس کا انتقال ۷۲۸ھ میں بصرہ ہی میں ہوا۔ فرزدق اور اس کے حریف جریر امیہ کے دور میں طنزیہ شاعری کے لیے بڑی شہرت رکھتے تھے۔

حضرت حسانؓ بن ثابت :۔ ابوالولید حسانؓ بن ثابت انصاری مدینہ میں پیدا ہوئے۔ زمانہ جاہلیت میں پرورش پا کر بڑے ہوئے۔ شاعری کو پیشہ بنایا اور اُسی کے سہارے زندگی بسر کی۔ یہ شاہانہ مناظرہ و غسانئہ کی مدح کرتے اور ان کے انعامات قبول کیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے آلِ حفینہ کی مدح کی اور زیادہ تر انہیں کے پاس مدد مانگنے کے لیے جاتے وہ بھی دل کھول کر اپنی بخششوں سے نوازتے۔ خود عیسائی مذہب پر رہتے اور حسانؓ کے اسلام قبول کر لینے کے باوجود بھی انہوں نے اس برتاؤ کی کوئی تبدیلی نہیں کی اور ان کے قاصد قسطنطنیہ سے ہدیے اور تحائف لے کر حسانؓ کے پاس آتے رہتے تھے جب آنحضرت صلعم ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو انصار کے ساتھ حسانؓ بھی مسلمان ہو گئے اور اپنی زندگی آنحضرتؐ کی مدح و حمایت میں وقف کر دی۔ جاہلیت میں حضرت حسانؓ شاہی شاعر، زمانہ نبوت میں شاعر رسالت مآب اور اسلام میں یمنیوں کے شاعر تھے ان کی شاعری میں فخر، حماسہ مدح و ہجو کو عنصر غالب ہے۔ انہوں نے بقیہ عمر نہایت عزت کے ساتھ گذاری بیت المال سے ان کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں تا آں کہ سنہ ۵۴ھ میں ۱۲۰ برس کی عمر پا کر وفات پائی۔ آخری عمر میں وہ بینائی سے محروم ہو چکے تھے۔

لَبید بن ربیعہ :- پورا نام ابو عقیل بن ربیعہ عامری ہے اُس نے جود و سخا اور جنگی ماحول میں پرورش پائی۔ اس کا باپ ربیعہ پریشان حالوں کا ملجا و ماویٰ تھا۔ لَبید قطعات طویل منظومات اور رجز کہتا تھا۔ جب دعوتِ اسلام ظاہر ہوئی تو وہ اپنی قوم کے ایک وفد میں آنحضرتؐ کے پاس حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اُس نے قرآن مجید حفظ کیا اور شاعری ترک کر دی یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اُس نے اسلام لانے کے بعد صرف ایک ہی شعر کہا تھا اور وہ یہ ہے۔

الحمد للّٰہ اذ لم یاء تنی أجلی
حتی لبست من الاسلام سربالا

یہی سبب ہے کہ اسلام کے بعد طویل عمر پانے کی باوجود جاہلی شعراء میں شمار کیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی خلافت میں جب کوفہ کا شہر بسایا گیا تو لَبید وہاں چلا گیا اور وہیں مقیم ہو گیا۔ اُسکی وفات معاویہ کی خلافت کے عوائل ۴۱ھ میں ہوئی اور اس نے ۱۴۵ برس کی عمر پائی تھی۔ لَبید بڑا فیاض نہایت دانا، وشریف النفس و پیکر مہر و مروت اور بہادر تھا اس کے یہی اخلاق اُسکی شاعری میں رواں دواں نظر آتے ہیں اُسکی نظم کی عبارت پر شوکت الفاظ کی ترتیب خوش نما ہے جس میں بھتی کے الفاظ نہیں۔ مرثیہ نگاری میں وہ اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔

عَمرو بن کلثوم :- عمرو بن کلثوم بن مالک تغلبی نے جزیرہ فرات میں قبیلہ تغلب کے معززوں کے گھروں میں پرورش پائی ۱۵ برس کا بھی نہ ہونے پایا تھا اپنی قوم میں معزز اور قبیلے کا سردار بن گیا۔ عمرو بن کلثوم غیور خوددار و بہادر اور فصیح و خوش گفتار اور برجستہ گو شاعر تھا۔ اُس کا طرز بیان اور مضمون نہایت پاکیزہ اور بلند ہوتا ہے۔ یہ کم گو شاعر ہے۔ اس نے شاعری کی بہت سی صنفوں میں طبع آزمائی نہیں کی نہ اپنی فطری قابلیت کو آزاد چھوڑا نہ اپنی خواہش اور طبعیت کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ اس کی شاعری کی مکمل کائنات ایک قصیدہ کا مشہور معلقہ ہے۔ باقی کچھ دوسرے قطعات ہیں جن کا موضوع معلقہ کے موضوع سے ہٹا ہوا نہیں ہے۔ اس کا انتقال چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں ہوا۔

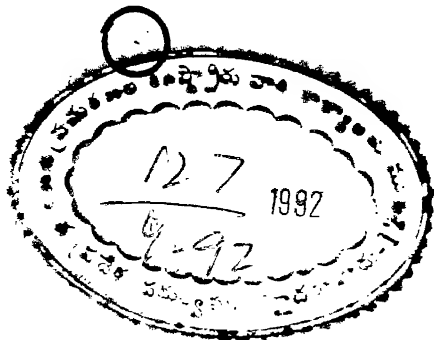
سرمد - حکیم سعید نام سرمد تخلص۔ ان کو عہدِ عالمگیری میں سزائے موت دی گئی۔ ہندوستان کی ادبی تاریخ میں ایک باعزت جگہ کے مستحق ہیں۔ ان کی رباعیات بڑی پُرلطف ہیں بعض تذکروں میں سرمد کے حالات "سعیدائے سرمد" کے عنوان سے درج ہیں۔ "دبستان مذہب" میں سرمد کے حالات کسی قدر تفصیل سے ملتے ہیں۔ سرمد نے داراشکوہ کی مصاحبت اختیار کی اور بالآخر یہی صحبت ان کی موت کا باعث ہوئی۔ یہ برہنہ رہا کرتے تھے۔ سنہ ۱۶۵۸ء میں جب عالمگیر تخت نشین ہوئے اور معاملات ملکی کو شرع کے قواعد پر ترتیب دینا شروع کیا۔ ان کے نزدیک سرمد کی برہنگی خلافِ شرع اور لائقِ تعزیر تھی۔ اورنگ زیب نے علماء سے کہا کہ سرمد سے کلمہ پڑھنے کہا جائے سرمد نے حسبِ عادت لاالٰہ سے زیادہ نہ پڑھا جو کلمہ کی نفی ہے۔ اس پر علماء نے اعتراض شروع کیا تو سرمد نے کہا کہ ابھی تک میں نفی میں مستغرق ہوں مرتبہ اثبات تک نہیں پہنچا جب پہنچوں گا تو اِلّا اللہ بھی کہوں گا۔ علمائے نے کفر کا فتویٰ جاری کیا کہ اگر سرمد توبہ کرے تو ٹھیک ہے ورنہ واجب القتل ہے۔ سرمد نے توبہ نہ کی چنانچہ دوسرے روز سرمد کو قتل کے لیئے جامع مسجد کے سامنے لے گئے۔ قتل کے وقت سرمد بڑے ہشاش بشاش تھے جلاد سامنے آیا تو مسکرا کر کہا "فدائے تو شوم۔ بیا بیا کہ بہر صورتے کہ می آئی من ترا خوب می شناسم" اور ذیل کا شعر پڑھ کر تلوار کے نیچے گردن رکھ دی۔

شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم
دیدیم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم

یہ واقعہ سنہ ۱۰۷۲ھ میں واقع ہوا اور دہلی کی جامع مسجد کے سیڑھیوں کے قریب دفن ہوئے۔ (مرتب)

مرتب کی دیگر مطبوعات

۱: تلامذۂ صفی اورنگ آبادی ——— 60/=
۲: اصلاحاتِ صفی اورنگ آبادی ——— زیرِ طبع
۳: محاوراتِ صفی اورنگ آبادی ——— زیرِ طبع
۴: صفی کے خطوط ——— زیرِ طبع



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

میں اپنے والد محترم حضرت غلام علی حاوی مغفور کے
اس مجموعہ کلام خیالاتِ حاوی کو اپنی والدہ محترمہ ——
سیدہ حیدری بیگم مرحومہ کے نام، جن کی حیاتِ مختصر ہی میرے
لیے سرمایۂ حیات تھی، اور والد بزرگوار کے پیرِ طریقت ——
حضرت سید محمد عمر حسینیؒ کے نام منسوب کرتا ہوں جن
کی دعاؤں کے طفیل اس علمی ورثہ کو عقیدت اور احترام کے ساتھ پیش
کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

محمد یحییٰ خالد
(اونٹاریو۔ کینیڈا)

مکتبِ صفؔی[1] کا مہرِ درخشاں

حضرت حاؔدی حیدرآبادی

حضرت صفؔی اورنگ آبادی کے ابتدائی دَور کے تلامذہ میں سے ایک حضرت غلام علی حاؔدی بھی ہیں جن کا نام پیرِ طریقت سید عُمر علیہ الرحمہ نے رکھا اور حضرت کیفی نے تخلص تجویز کیا۔ وہ دکن کے اُفقِ شاعری پر ہلال بن کر اُبھرے اور بدرِ کامل کی طرح ہمیشہ درخشاں رہے۔ جن کے بارے میں ان کے پچاس سالہ دیرینہ رفیق و ہمدم اور استاد بھائی، الحاج میر بہادر علی جوہر شائستہ انداز میں بیان کرتے تھے کہ "حاؔدی صاحب اپنی مشقِ سُخن کے دوران بہت جلد اصلاح سے بے نیاز ہو گئے لیکن وہ اپنے استاد کی زندگی تک اپنا کلام ان کی خدمت میں اصلاح کے لیے پیش کرتے رہے حال آں کہ حضرت صفؔی صاحب نے اپنے کئی فنی متوسلین کو ان کے تفویض کر دیا تھا۔" ان کی علمیت، قوتِ حافظہ ذہانت و ذکاوت، جودتِ طبع، سخن شناسی اور سخن گوئی کی فطری صلاحیتوں نے بہت جلد اپنے استاد کے دل میں جگہ پالی۔ استاد کے مشفقانہ سلوک سے ان کے حوصلوں کو توانائی ملی اور فطری اور فکری جولانیوں نے اپنا رنگ جمانا شروع کیا اور یہ رنگ بہت کم مُدت میں مختلف اصنافِ سخن کے ذریعہ ایسا نکھرتا گیا کہ ہر طرف سے صدائے آفریں بلند ہونے لگی۔ انھوں نے تمام اصنافِ سُخن جیسے مثلاً غزل، رباعی، قطعہ، قصیدہ، مثنوی، نظم، تاریخ گوئی وغیرہ میں بے تکلف ماہرانہ انداز میں

---

[1] فاضل مضمون نگار کے اچانک عمرہ پر روانہ ہوتے اور وہاں سے امریکہ چلے جانے کی وجہ سے مضمون تاخیر سے وصول ہوا۔ اس لیے قارئین اکرام اس طرز کی صفحہ اندازی کو ہماری مجبوری کے پیشِ نظر گوارا فرمالیں کتاب کے حُسن میں اس بدنمائی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ [مرتب]



خواجہ معین الدین عزمی

طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل ہی کو اپنا ذریعہ اظہار اور موضوع سخن بنایا۔ شاید ان کی اسی کامیاب فکرِ سخن، زبان و بیان پر عبور اور کلام میں کمالِ قدرت کے علاوہ اور دیگر خوبیوں اور اوصاف کی وجہ سے حضرت صفی اکثر فرماتے تھے کہ "حادی سب پر حادی ہے"۔ وہ انھیں "مولوی" کہہ کر پکارتے تھے۔ ؎

کس نے "حادی سب پر حادی ہے" کہا
ہم نے ارشادِ صفی بھولا نہیں [صدیقی]

آیئے پہلے ان کی شخصیت سے تعارف حاصل کرلیں پھر ان کی ذات میں چھپے ہوئے سادہ لوح، منکسر المزاج، خاموش فطرت، مخلص، کم آمیز، پُر اخلاق، وضع دار، پیکرِ مروت، مجسم شرافت انسان اور صاحبِ طرز نثر نگار، زود گو اور پُر گو شاعر، ماہر عروض داں اور نامور استادِ سخن کو تلاش کرنے کی جستجو کریں۔

جانشین حضرت صفی اورنگ آبادی بتاریخ ۲۷ر جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ کو حیدرآباد کے ایک محلہ چھاؤنی غلام مرتضیٰ کمندان بیرون لال دروازہ میں پیدا ہوئے۔ چمنستانِ اسلام کے پاسباں اور میکدۂ عرفان کے ساقی میر پرورش علی حسینیؒ المعروف بنام سید محمد بادشاہ حسینیؒ [م ۲۳ر ربیع الثانی ۱۲۶۸ھ] اتالیقِ آصف جاہ خامس نواب میر تہنیت علی خان افضل الدولہ کے فرزند شمس المفسرین حضرت سید عمرؒ خلیق [م ۱۹ر صفر ۱۳۳۰ھ] نے ان کا نام غلام علی رکھا۔ ان کے والد کا نام محمد عباس علی تھا۔ وہ شیخ صدیقی تھے۔ اس دور کے دستور کے مطابق کلامِ رب قرآن سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ آپ نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم ایک گوشہ نشین بزرگ مسجدِ جلوخانہ کے امام سے حاصل کی۔ ۱۹۲۲ء م ۱۳۴۰ھ میں جامعہ نظامیہ حیدرآباد سے مولوی کا امتحان کامیاب کرلیا پھر اپنے ذوقِ علمی کی تسکین کے لیے مولانا محمد جعفر مرحوم [شیخ الادب عربی جامعہ نظامیہ و برادرِ بزرگ پروفیسر عبدالقادر سروری]

سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ) اور مولانا مفتی رحیم الدین مغفور سے علوم متداولہ کی کتابیں پڑھیں۔ بچپن سے علم حاصل کرنے کی جستجو اور لگن تھی۔ تشنگی بڑھتی گئی۔ فارسی اور عربی علوم کی تکمیل مولانا حکیم سید عبدالباقی شطاری رحؒ کی نگرانی میں کی۔ ۱۹۲۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اور ۱۹۳۱ء میں مدراس یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان درجہ اول میں کامیاب کیا۔ جب کہ مولوی کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد اس امتحان کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن اپنے آپ کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کی دُھن سوار تھی۔ اگر مواقع حاصل ہوتے تو اس سے بھی دَور دراز کا سفر طے کرنے میں کبھی دریغ نہ کرتے۔ معلوم نہیں فنِ خطاطی میں کس کے شاگرد رہے۔ خط نہایت صاف ستھرا، پاکیزہ اور دلکش تھا۔ ابتداء میں یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد کی پیشی کے خوش نویس کی حیثیت سے کام کیے۔ پھر نظامت صرفخاص امورِ مذہبی، صدر محاسبی اور خزانہ عامرہ سرکارِ عالی میں کارگزار رہ کر ۱۹۵۴ء میں وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

ابتدائی عمر ہی سے طبیعت موزوں تھی۔ شعرگوئی کا شوق پروان چڑھنے لگا تو سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں مکتب داغ کی آخری شمع استادالاساتذہ حضرت صفی اورنگ آبادی سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۳۳۷ھ میں پہلی مرتبہ حضرت میر بہبود علی صفی نے اپنے استاد حضرت رضی الدین کیفی کی خدمت میں انہیں پیش کیا تو نام کی مناسبت سے حضرت کیفی نے فرمایا "ہمارے پاس ایک تخلص حاوی ہے۔ تم لے لو"۔ چناں چہ پہلے کے تخلص ضیف کی بجائے اِسے اختیار کیا اور یہ تخلص حاوی آگے چل کر اسم بامسمّٰی ثابت ہوا۔

حضرت حاؔوی کی شادی تیس سال کی عمر میں گلبرگہ شریف سے تعلق رکھنے والے ایک سادات گھرانے میں خواجہ احمد اللہ حسینی قادری کی صاحبزادی اور خواجہ عبدالرزاق حسینی قادری کی حقیقی ہمشیرہ سے ہوئی۔ ایک طویل عرصے

تک اولاد کی خوشی سے محروم اور مایوس رہے۔ قادرِ مطلق کی اعجاز نمائی کہ جس سال کیپٹن اعجاز علی شہرت کی دخترِ صفیہ بیگم سے دوسری شادی کی تو معلوم ہوا کہ اٹھارہ سال بعد پہلی بیوی صاحبِ اولاد ہونے والی ہیں۔ یاس نے منہ موڑا، امید نے ڈیرا ڈالا۔ دل کے کنول کھل اٹھے برسوں کی تمنا پوری ہوئی۔ آرزو بر آئی۔ مگر ع دل پہ کیا نہیں بیتی آرزو بر آنے تک! بہرحال اولادِ نرینہ کی ولادت سے خوشیاں اور بھی دوبالا ہوگئیں۔ خیال چہ موجودہ میٹ اکلوتے صاحبزادے محمد یحییٰ خالد انہی کے بطن سے ہیں۔ دوسری بیوی جنکم کے ایک مدرسہ میں معلمہ تھیں۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ عزیزی یحییٰ خالد کی والدہ کا انتقال ۱۹۵۳ء میں ہوا اور اس کے قریباً نو سال بعد ۱۹۶۲ء میں محلِ دوم داغِ مفارقت دے گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت حادی اپنے چھوٹے بھائی صابر علی شاکر کے ساتھ رہنے لگے۔

گھر کی بستی پہلے ہی سونی ہو چکی تھی۔ آنکھوں کے نور دل کے سرور اکلوتے صاحبزادے بھی فکرِ معاش میں مدینہ منورہ چلے گئے ۱۹۶۷ء میں حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ فریضۂ حج ادا ہو چکا تو اب مالکِ حقیقی کی دھن بڑھتی چلی گئی۔ حیات و کائنات کی گتھیاں سلجھنے لگیں۔ فرماتے ہیں ؎

خونِ دل اپنا پی کے جیتا ہوں ؛ اب یہ آبِ حیات ہو کہ نہ ہو
اے مری کائنات کے مالک! ؛ تو ہو بس، کائنات ہو کہ نہ ہو

اِنسان جو اسیرِ غم و نشاط ہے اِس کی حیثیت ایک بازیچہ سے بڑھ کر نہیں۔ بازی گرِ آسماں کچھ دیر نچا کر اسے نیست و نابود کر دیتا ہے اور وہ اپنی تمام آرزوئیں اپنے دل میں لیے بہ حسرت و یاس زیرِ خاک چلا جاتا ہے اور کوئی اس کو موت و زیست کے معمہ سے واقف نہیں کراتا۔ اگر اس میں اہلیت ہو تو اس کے کلام یا تحریر و تقریر میں مشاہدات کا عکس جھلک اٹھتا ہے۔ یہاں بے محل نہ ہو تو ان کی غزلوں کے یہ چند مختلف اشعار ملاحظہ فرمایئے